اشاعت کا اکہترواں سال

ماہنامہ

جولائی 2014ء

طلوعِ اسلام

لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

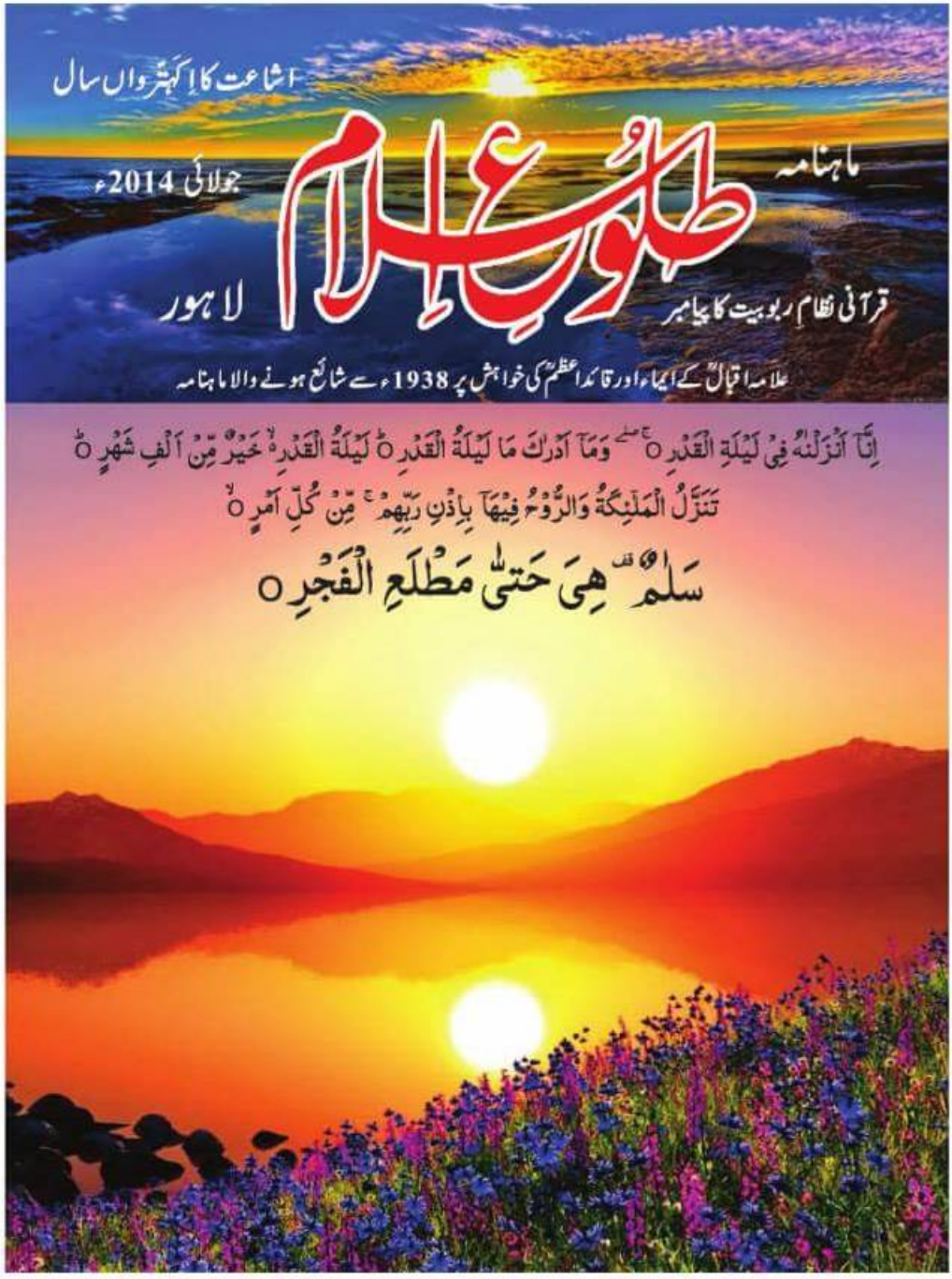

جلد 67 شمارہ نمبر 7 جولائی 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: عائلی قوانین (قرآنِ کریم کی روشنی میں)	ادارہ	3
قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر	پرویزؒ	13
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	21
پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت	ملک منظور حسین لیل	29
الھدایۃ والعرفان فی تفسیر القرآن بالقرآن	آصف جلیل	39

ENGLISH SECTION

SYSTEMS EXCERPT *Saleena Karim* 45

Surah *Al-Qiyamah* – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 26 Translated by: Dr. Mansoor Alam 50

دفتر کا پتہ 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546، 042-35764484

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8

ادارہ

لمعات

عائلی قوانین
(قرآنِ کریم کی روشنی میں)

ہمارے ہاں کے مروّجہ شخصی قوانین میں، جو صدیوں سے رائج چلے آ رہے ہیں، سابق صدر محمد ایوب خان مرحوم نے 1961ء میں ایک آرڈیننس کی رُو سے ان میں کچھ ترمیمات کی تھیں۔ یہ ترمیمات من وعن قرآنِ کریم کے مطابق تو نہیں تھیں لیکن اس وقت تک مروّجہ قوانین کے مقابلہ میں منشاء قرآن سے بہرحال زیادہ قریب تھیں۔ چنانچہ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کی سخت مخالفت بھی ہوتی رہی ہے۔ طلوع اسلام بابت اگست 1962ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ان قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا کہ یہ قوانین کسی حد تک قرآنی منشاء کے قریب ہیں اور ان میں کہاں کہاں ترمیم واصلاح کی ضرورت ہے۔ آج 2014ء میں ہماری اسلامی نظریاتی کونسل میں عائلی قوانین پھر سے زیر بحث آئے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے وہ مقالہ ایک بار پھر درج ذیل کیا جا رہا ہے۔

1- نکاح

قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ''نکاح'' کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے **مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا** (4:21)۔ ''پختہ عہد'' سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ، ان کی باہمی رضامندی سے، بلا کسی قسم کے جبر واکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے ''نکاح کی عمر'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

بلوغت

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (4:6)

(تم جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) انہیں پرکھتے رہو تاآنکہ وہ ''نکاح کی عمر'' کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم ''نکاح کی عمر'' کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (6:152)۔ جب وہ ''جوانی کی عمر'' تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ''نکاح کی عمر'' جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتا۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) ''تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں''۔ اور عورتوں کے متعلق کہا کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19)۔ ''تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں''۔

لہٰذا، جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی (سرپرست) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔

2- نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے ''نکاح'' کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآنِ کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے اس کی وضاحت کہہ کر دی ہے۔ ''مُحْصِنِيْنَ'' کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور مسافحین سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2:228) قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ''ازواج'' (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ: لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (30:21) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (30:21) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے (2:221) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں

ہم آہنگی خیالات نہ ہو اُن کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے (2:221)۔

مروّجہ قانون

حالیہ نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(ج) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (2:282)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حالیہ عائلی قوانین میں اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور مولوی صاحبان اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

2- مہر

چونکہ ازدواجی میزان میں عورت کا پلڑہ بمقابلہ مرد کے جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے (4:4) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہئے۔ (دیکھئے 2:236، 4:20)

(ج) مہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے (4:4)۔

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اُسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہئے (2:236)۔

مروّجہ قانون

حالیہ عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی کے معاہدہ میں مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ عند الطلب واجب الادا ہے۔ قرآن کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

3- طلاق

طلاق کے معنی ہیں۔ "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے

استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی مرضی سے اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں سورۃ النساء میں ہے:۔

اگر تم کسی میاں بیوی میں باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جاسکتی ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (4:35)

(2) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہو المراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہوگی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہوگا۔

طلاق کے بارے میں حالیہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(i) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(ii) چیئرمین ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ سے نوے دن کے بعد طلاق مؤثر ہو جائے گی۔ یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصور ہوگا۔

شق (i) میں نقص یہ ہے کہ:۔

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلافِ قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہئے کہ:۔

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش بے معنی چیز ہے۔

(ب) دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

''بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے'' کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے' میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں' مرد' طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے' انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروّجہ قانون کی رُو سے' اگر بیوی کو' باضابطہ طلاق کا حق'' نہ دیا گیا ہو' تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لئے' الگ الگ قوانین' قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہوگی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا' اس شق کی صورت یوں ہونی چاہئے کہ:۔

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے۔.....

شق (ii)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوے دن بعد' طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ (نوے دن بطور عدت رکھے گئے ہیں)۔

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہوگی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدت بھی اُسی وقت سے شروع ہوگی۔

(ب) عدت کی مدت' مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں' عائلی قوانین کی رُو سے' یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے' ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں[1]۔

مولوی صاحبان کی طرف سے طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

---

1 اب اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

(۱) مرد کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

(۲) اگر عورت گلوخلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو ''حق مہر'' چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

4- طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہوگیا۔ اس کے بعد عدت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں تو آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے عدت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے کسی دوسری عورت سے شادی کرسکتا ہے بس یہ ایک ''زائد حق'' ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (2:228) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدت کی مدت کے بعد بھی آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کرلی لیکن اس کے بعد پھر مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق ان میں طلاق ہوگئی تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی عدت کے دوران یا عدت کے بعد آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی شادی ہوگی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہوجائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کرسکتے نہ عدت کے دوران نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (2:229)۔ ''طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم قاعدے کے مطابق عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کرسکتے ہو''۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کرسکتے یہ مطلب ہے ''تین طلاق'' سے۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآنِ کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہوجائے تو پھر یہ عورت اگر چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کرسکتی ہے۔ (2:230)۔

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے تین دفعہ (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی۔ اس کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ یہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے

دے۔اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرسکتی ہے۔اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

5- تعددِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن وسکون کی زندگی بسر کرسکے۔میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر ''جنت'' بن جائے۔اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں' خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔نکاح' فریقین کی رضامندی سے' بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود' اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے' تو نکاح کا معاہدہ فسخ کرلیا جائے' اور کسی دوسری عورت (یا مرد) سے شادی کرلی جائے۔سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ..... (4:20) ''اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جاچکا ہے)۔پہلی بیوی سے' معاہدۂ نکاح فسخ کرلو' اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' شادی کا اُصول'' ایک وقت میں ایک بیوی'' (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآنِ کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوسکتے ہیں جن کے پیشِ نظر' اس اصولی قانون میں' استثناء کی ضرورت لاحق ہوجائے۔اس قسم کے حالات' اِسلام کے ابتدائی دور میں' مدینہ کی زندگی میں پیدا ہوگئے تھے۔اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:۔

(i) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں' جو ۲ھ میں ہوئی تھی' مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو رسول اللہ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے' اس مختصر سی جماعت میں' نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے ان کے علاوہ مسلمان عورتیں' مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر' مدینہ کی طرف آنا شروع ہوگئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں' صرف مسلمان مردوں سے شادی کرسکتی تھیں۔کسی غیر مسلم سے نہیں کرسکتی تھیں۔حتیٰ کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا' اُس وقت صورت یہ پیدا ہوگئی کہ بیواؤں کی۔اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد' مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں' اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ''ایک بیوی'' کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔اس مقصد کے پیشِ نظر' قرآن نے کہا کہ:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (4:3)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی .....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے.....تو

عربی زبان میں ''یَتٰمٰی'' یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآنِ کریم میں یتامی النساء انہی معنوں میں آیا ہے۔ 4:127) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں' اور ایک مرد۔ ایک عورت' کے اصول کے مطابق' ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں' ان سے نکاح کر لو۔ دو' دو۔ تین تین۔ چار' چار تک

یعنی ایسی صورت میں ''ایک بیوی'' کے اصول میں استثناء کر لو اور اِن بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اُس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے' مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے' تو پھر وہی ''ایک بیوی'' کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ ''عدل'' کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے' ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے (4:129)..... کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ' جسے تم محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ..... جو بیچاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بیکس اور لاوارث ہے..... نہ اِدھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری بیوی لانے کے لئے' پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ:۔

(i) قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون واطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی' پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے' تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکتی ہے' اور گھر میں سکون واطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی عدم رضامندی سے دوسری

بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے اپنے بستے رَستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآنِ کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی' دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آ جائے' تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تا کہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی' تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی' اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہو گی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہو گی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے' یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے' پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے' خود نبی اکرم ﷺ کے ایک ذاتی فیصلہ سے بھی ثابت ہے۔

> ایک دفعہ حضرت علیؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (ﷺ) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی۔ فرمایا۔ ''میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا' مجھے اذیت ہو گی''۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادے سے باز آ گئے' اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔ سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری

ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا ہے اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہو گا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے' وہ رسول اللہؐ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائے گا کہ پہلی بیوی' دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حالات کے پیشِ نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے' ان میں' مومن عورتیں' اپنی خانماں برباد' لاوارث' بے کس بہنوں کی امداد کے لئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہوں گی (اور انہی جیسے حالات میں' مومن عورتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی' پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنونِ احسان ہو گی۔

لیکن اس کے باوجود' اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے' دوسری شادی کے حق میں نہیں' تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزوِ خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں۔

☆.....☆.....☆

دوسری شادی کے لئے' قرآنِ کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ عدل

حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصدِ اوّل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضور ﷺ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) زندہ رہیں' حضور ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی' حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود' دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ اس وقت حضور ﷺ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی..... جو بیٹے پیدا ہوئے تھے وہ وفات پا چکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی تمام نکاح' ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے' اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس' بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔ چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> محمد ﷺ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس' بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔ (MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ کیا ان شادیوں میں' پہلی ازواجِ مطہراتؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارک باد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں۔

☆.....☆.....☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویزؒ

پہلی قسط

قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر

SEX AND CULTURE

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی' حیوانی سطح سے انسانی پیکر پر پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص ولزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا' پینا' سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل Procreation اور اس کے لئے جنسی جذبہ Sexual Instinct بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں' حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے ازخود عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے' گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں ازخود عائد ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس' انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخِ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے اس پر فطرت کی طرف سے ازخود ایسی پابندیاں نہیں عائد ہوتیں جیسی حیوانات پر عائد ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوں)۔

معاشرتی پابندیاں:۔ معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بناء پر بدلی بھی جاسکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رو سے عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہئے۔ اس فیصلہ کی رو سے (Keep to the left) سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر ''دائیں طرف چلو'' کا قانون

بھی نافذ کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً لحم خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحی خداوندی کے ماننے والوں کو لحم خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے' اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی۔ لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار وارادہ سے کرنا ہوگا۔

جنسی جذبہ پر پابندیاں:۔ کھانے پینے کے علاوہ جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرار حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عائد کیا گیا وہ جب جی چاہے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کرسکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عائد کی جاتی ہیں اور وحی کی رو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام وممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں۔ نیز کسی ایک ہی قوم میں مختلف زمانوں میں ان پابندیوں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کرلیں تو معاشرے کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردوبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہوجائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے۔ ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس وقت ان فیصلوں پر تنقید وتبصرہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کرسکتا ہے۔

وحی کی پابندیاں:۔ اس کے برعکس' اس باب میں وحی (یعنی قرآن کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں اور شادی کے بعد' نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کرسکتی ہے' نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط فرد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا جرم ہے اور اس (جرم زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جاسکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متاثر ہوکر ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائش نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور

لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہئے اور نکاح وغیرہ کی پابندی محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہئے نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) کی فضا عام ہوتی جارہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں (یعنی عفت وعصمت (Chastity) کے مطالبہ) کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جارہا ہے۔

ان پابندیوں کی مصلحت:۔ سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں یا ان کا تعلق عالم انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ہے تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مصالح کے پیش نظر ان میں ردوبدل کرلے لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالَّذِيْنَ (23:1) هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (23:5) تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ عفت وعصمت کا' قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام (Prosperous) نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان (Faith) ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔

قرآنی دعوے کی دلیل:۔ ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھالیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم وبصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل وبرہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ..... (41:53) ہم انہیں انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاآنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہوچکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور وخوض کیا جائے۔

غور وفکر:۔ جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے۔ زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو! حقیقت یہ ہے کہ

جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔

علمائے مغرب کی تحقیقات:۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات Sociologists تہذیب کے مورخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیہ نفس Psycho-Analysts وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں Primitive Tribes کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (Data) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں (۱)۔ اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گذار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو کچھ وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (Culture) کا اس سوال سے گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔

ڈاکٹر انون Dr.J.D.Unwin:۔ انہیں محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J.D.Unwin کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے ۸۰ غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (Sex and Culture) میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:۔

دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل۔ سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے اس

لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔ (XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (ص ۳۴۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ:۔

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:۔

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (ص ۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آ جائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرد:۔ سب سے پہلے تجرد کی زندگی (Celibacy) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ:

جبری تجرد (Compulsory Celibacy) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (ص ۸۴)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (Nuns) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر

مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے (دیباچہ ص xii)

☆.....☆.....☆

تین گروہ:۔ اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (Zoistic) رکھتا ہے اور اسے اوپر (Manistic) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (Deistic) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ ۸۰ قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جس گروہ نے کنوارپن (Pre-Nuptiali) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

۲۔ جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔

۳۔ تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و پاکارت (Chastity) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (ص ۳۲۵-۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ:

> شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

۱۔ عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے ان کے رشتہ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدت زوج (Absolute Monogamy) ہے۔

۲۔ رشتہ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو اسے وہ ترمیم شدہ وحدت زوج (Modified Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

۳۔ عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعداد ازدواج (Absolute Polygamy) ہے۔ اور

۴۔ اگر مرد دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم تعداد ازدواج (Polygamy Modified) کہتا ہے۔ (جاری ہے)

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورہ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بنجر پاکستان میں، باغبانی اور جنگل کاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے

☆ 2014ء مری میں باغبانی کی 101 ویں سالگرہ ہے

☆ پاکستان بھر کے باغبانوں، زرعی اداروں، زرعی یونیورسٹیوں اور پورے پاکستان کے محکمہ جنگلات اور محکمہ ماحولیات کے دانشور خواتین وحضرات سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ 2014ء کو

''بنجر پاکستان میں باغبانی اور جنگل کاری'' کے طور پر منائیں اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

☆ بنجر پاکستان آباد ہوگا

☆ بنجر پاکستان میں باغبانی ہوگی

☆ بنجر پاکستان میں جنگل کاری ہوگی

☆ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے

☆ غربت کے خاتمہ میں مدد ملے گی

☆ ماحولیات کے لئے یہ سال بطور خاص اہمیت حاصل کرے گا

☆ جہاں مری کے باغبان اپنی 101 ویں سالگرہ منائیں گے وہاں پورے پاکستان کا ساتھ دیتے ہوئے 2014ء کو باغبانی اور جنگل کاری کے طور پر منائیں گے

☆ 100 سالہ پودہ جات میں مری کا آملہ۔ دیسی انار۔ ناکھ ناشپاتی۔ اخروٹ۔ ہاڑی۔ شہتوت۔ بٹنگی۔ پھگواڑی اور ریٹھا کے پودے شامل ہیں۔ لاہور چڑیا گھر کا برگد کا درخت سو سالہ ہے۔ دیگر معلومات درکار ہیں۔

پتہ رابطہ

(1) ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیداں نیو مری

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیداں سوہاوہ جہلم

(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن میاں چنوں خانیوال

(4) ڈاکٹر حامد حسین نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن بلاک C ڈیرہ غازی خان

(5) طارق ایم ملک شعبہ نشر واشاعت باغبان ایسوسی ایشن چارہان نیو مری

(6) احمد نواز خان تاحیات ممبر باغبان ایسوسی ایشن گاؤں گھماواں نوانشہر ایبٹ آباد

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

دوسری قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

قرآنِ کریم میں بیان کئے گئے ''دِلوں کے عوارض'' کو ماہرین طب نفسی (Psychiatrists) نے ذہنی ونفسیاتی امراض سے تعبیر کیا ہے۔ اِن بیماریوں کی اقسام بتائی ہیں اوران کی درجہ بندی کی ہے۔ ابتداء امریکی ماہرین نفسیات نے کی اور تشخیص اور شماریاتی کتابچہ برائے ذہنی امراض (Diagnostic and statistical manual of mental disorders) کی تین فہرستیں شائع کرائیں لیکن پھر بھی اتفاق نہ ہوسکا۔ ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کی درجہ بندی کے لئے عالمی ادارہ برائے صحت (W.H.O) نے بھی تمام دنیا میں پائی جانے والی ذہنی وجسمانی بیماریوں کی جامع درجہ بندی کی ہے۔ ماہرین کے سات برس کے کام اور مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام موجود ذہنی علامات کی ایک مکمل فہرست سامنے آئی۔ اس درجہ بندی کو بین الاقوامی شماریاتی فہرست برائے امراض، زخم وموت (International statistical classification of diseases, injureis and cause of death) کہا جاتا ہے مخفف کے طور پر اسے (ICD-9) کہا جاتا ہے۔ اس فہرست کا ایک حصہ ذہنی ونفسیاتی امراض کی درجہ بندی پر مشتمل ہے اور دنیا بھر کے ماہرین طب نفسی اسی کے مطابق تحقیق وتفتیش کرتے ہیں۔ آئی سی ڈی 9 تمام ذہنی بیماریوں کو چار واضح گروہوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اول۔ عضوی اختلال ذہنی (Organic psychotic condidtions) دوم۔ دیگر اختلال ذہنی (Other Psychoses) سوم۔ اعصابی خلل، شخصیاتی خلل اور دیگر غیر اختلالی ذہنی خلل (Neurotic disorders, Personality disorders, and other Non-Psychotic mental disorders).

چہارم۔ ذہنی ابطاء (Mental Retardation)۔ آگے ان گروہوں میں شامل بیماریوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چند امراض یہ ہیں۔ کبرسنی اور قبل کبرسنی، عضوی اختلال وذہنی کیفیات، ادویات یا منشیات سے متعلق اختلالِ ذہنی، الکحل سے متعلق اختلال ذہنی، عصابی یا نیوراتی (Neurotic) خلل، شخصیاتی خلل، جنسی عارضے اور انحراف، الکحل پر انحصار کی علامت، ذہنی وجوہات سے پیدا شدہ فعلیاتی خلل، اشقاق ذہنی، تحسیسی اختلال، خبط عظمت، دماغی گزند، کردار کے غیر متذکرہ اضطراب، بچپن اور جوانی کے مخصوص جذباتی اضطراب، جسمانی بیماریاں جو نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ہوں، معمولی ذہنی پسماندگی اور مخصوص وغیر مخصوص ذہنی پسماندگی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں ہر ایک قسم کی مزید مختلف اقسام کا بھی ذکر ہے جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ اور ہر قسم کی تفصیلی بحث الگ الگ ہے۔

مثلاً نیوراتی امراض کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس کے تحت تشویش (Anxiety) بے جا خوف (Fobic state) خبط

(Obsession) اجبار (Compulsion) خبطی اجبار (Obsessive Compulsion) اور اختناق (Hyesteria) وغیرہ جیسی ذہنی بیماریاں آتی ہیں۔ ان نفسیاتی بیماریوں کی تفصیل میں جائیں تو مزید ذہنی اختلال کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان ذہنی ونفسیاتی بیماریوں میں ایک بڑی بیماری حزن (Fear and grief) کا مرض ہے۔ قرآن مجید کے مطابق اللہ نے ہبوط آدم کے وقت فرمادیا تھا کہ انعاماتِ خداوندی کے رواں چشمے کو تقسیم کرکے اور تیری اور میری کا سوال پیدا کرکے انسان بلند مقام سے پست سطح پر تو آ گیا ہے لیکن اس کی یہ گراوٹ ابدی نہیں۔ ''ہماری طرف سے تمہیں راہنمائی (ہمارے رسولوں کی معرفت) ملتی رہے گی۔ سو جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو وہ لوگ خوف وحزن سے مامون اور محفوظ ہوجائیں گے'' 2:38۔ یہاں اتباع ہدایت کا نتیجہ خوف وحزن سے مامونیت بتایا گیا ہے۔ خوف عام طور پر بیرونی خطرات اور نقصانات کے احساس کو کہا جاتا ہے' اور حزن کے معنی ہوتے ہیں' افسردگی' پژمردگی' پریشانی' عرب اس لفظ کو معاشی پریشانی کے لئے خاص طور پر بولتے تھے۔ علم النفس کی تحقیق کے مطابق بھی اکثر نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔ اس کے علاوہ خوف سے انسانی ذات (نفس) میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے قوانین خداوندی پر مبنی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں انسان کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ حزن۔ ''جو شخص قوانین خداوندی کی صداقتوں کو تسلیم کرکے' ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا تو اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔'' ''اسے نہ کسی قسم کی ناانصافی اور دھاندلی کا خوف ہوگا نہ استحصال کا ڈر 20:112۔'' ''اسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب ونہب کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی ذلت ورسوائی کا خوف'' 72:13۔ جنتی زندگی' چاہے' اس دنیا میں ہو یا آخرت میں اس کو کسی قسم کا خوف وحزن لاحق نہیں ہوتا 7:49' 43:68۔ یہی وہ خوش نصیب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست کہا ہے 10:62۔ یعنی ''وہ لوگ جو اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر وہ اپنے اس اقرار پر جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کرسکتی'' 32-41:31۔

قرآن پاک نے منافقت کو نفسیاتی مرض قرار دیا ہے 2:10۔ ماہرین نفسیات کے مطابق نفسیاتی امراض کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کی اصل علت (Cause) معلوم نہ ہوجائے' نہ صرف یہ کہ ان کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ہر غلط علاج سے مرض اور بڑھتا ہے جیسے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور یوں یہ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور کذب اور جھوٹ ان کا شعار بن جاتا ہے۔ کفر کا بنیادی تعلق انسانی فہم وادراک (نفسیات) کی غلطی یا غلط نگہی سے ہے اس لئے اس نفسیاتی بیماری سے پیدا ہونے والے کرب واضطراب کو قرآن مجید نے عذاب الیم 2:10 کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی بقول پرویز صاحب! ''اگر کفر کا نتیجہ دردِ سر ہے تو منافقت کا نتیجہ دردِ جگر''۔ ماہرین کے مطابق خوف وتشویش نیوراتی امراض کی اولین اور سب سے زیادہ تعداد میں پائی جانے والی قسم ہے۔ تشویش کا مریض اپنی زندگی کا زیادہ حصہ کسی انجانے خوف میں گزار دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف وفکر کوئی مخصوص شکل بھی اختیار کرلیتا ہے' مثلاً اگر کسی شخص کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے کہ وہ اپنی عزیز ترین متاع سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو اس کے اس ذہنی عمل کو نیوراتی مرض (Neurotic disorder) کہا جائے گا۔ کسی حقیقی خطرے کو سامنے دیکھ کر تشویش پیدا ہوجانا ایک قدرتی عمل ہے اور اپنے

بچاؤ کا مناسب بندوبست کرنے کی خاطر ایسا ہونا لازمی بھی ہے۔ یہ بیماری کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس کے برعکس ایک نیوراتی مریض میں کسی حقیقی خطرے کے بغیر تشویش پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ماہرین نے نیوراتی تشویش اور عام تشویش میں فرق کیا ہے۔ ایک اور فرق ان میں یہ ہے کہ عام تشویش حالات کے تبدیل ہونے سے ختم ہو جاتی ہے جبکہ نیوراتی مریض پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اسی طرح بے جا خوف (Phobic state) میں مبتلا مریض فرضی چیزوں یا خطرات سے ڈرنے لگتا ہے۔ مثلاً سرخ پھول دیکھ کر، کسی کتاب کا صفحہ نمبر 19 دیکھ کر، معصوم چڑیا کی تصویر دیکھ کر، ریل کی سیٹی کی آواز سن کر، اونچی بلڈنگ سے نیچے دیکھ یا موٹر کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر، ڈر کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ بے جا خوف ہزاروں صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ ابھی تک خوف و تشویش کی مختلف شکلوں کی باقاعدہ فہرست سامنے نہیں آئی۔ اس کی وجہ سے نیوراسس (Neurosis) اور شدید جذباتی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اخراج و نکاس نامعلوم رہتا ہے اور تشویش کی بڑھی ہوئی کیفیت سے انسان پر جذباتی آسودگی، جذباتی آزادی اور جذباتی کیف و انبساط کی راہیں بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ تشویش کی خاصیت ہی یہ ہے کہ فرد کو نہ اس کے منبع کا شعوری احساس ہوتا ہے نہ اس پر قابو پانے کی قدرت ہوتی ہے۔ یہ مجبوری اور بے بسی اس کیفیت کو مزید پیچیدہ بناتی ہے۔ ایسی صورت میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور اس کے زیر اثر منفی جذبات مثلاً غصہ، چڑچڑاپن، مخاصمت اور عداوت وغیرہ کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں جو مزید پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مریضانہ منزل ہے اور اس کی طرف توجہ دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ورنہ شدید صورتوں میں خلل دماغ (Psychosis) کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس بیماری کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ ہر عمر کے نارمل جذبات اور تقاضات کا اندازہ کر کے ان کی صحت مند نکاسی اور نشوونما کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

اس سلسلے میں پروفیسر ساجدہ زیدی نے ایک اور خرابی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ہماری ذہنی نشوونما کا ایک بڑا وسیلہ ہمارا ادراک ہے اور ہمارے ادراک کی نوعیت کا بڑی حد تک تعین ہمارے شوق و دلچسپی اور ہمارے زاویہ نظر سے ہوتا ہے۔ یعنی ہم تقریباً لاشعوری طور پر انہیں مدرکات کا انتخاب کرتے ہیں جن سے ہمیں لگاؤ پیدا ہو چکا ہوتا ہے اور جس کے بارے میں ہمارا شوق و تجسس زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کے ذہن پر اگر کوئی فکر چھائی ہو، اگر اسے کسی سلسلے میں تشویش پیدا ہو چکی ہو اور اس کا جذباتی آہنگ مجروح ہو چکا ہو تو وہ عموماً اپنی دلچسپی کی چیزوں کا بھی پورے طور پر ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن تشویش و فکرمندی کے احساسات میں الجھا رہتا ہے وہ پورے طور پر فعال نہیں ہوتا اور اس کی مشاہدہ و ادراک کی صلاحیت تشویش و فکر کے پردوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں خارجی اشیاء اور عوامل کا ادراک عموماً زیادہ مشکل ہو جاتا ہے"۔ پروفیسر ساجدہ نے یہاں پر ایک اہم اور دور رس نتائج کے حامل مسئلہ (Proposition) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان اس کائنات، جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے، کی طرف مختلف قسم کی آرزوؤں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک علم کی آرزو ہے۔ خداداد صلاحیتوں کی بنا پر حصول علم اور اس علم کی سطح پر انسانی شعور میں حقیقت کے اجزاء پہلوؤں کو سمجھنے کی طلب پائی جاتی ہے۔ فلسفیانہ سطح پر انسانی شعور کا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت من حیث الکل کا یعنی منتہائے حقیقت کا علم حاصل کرے۔ علم کی کوئی شاخ مثلاً علم سیاسیات، عمرانیات، علم معاشیات، علم طبعیات اور علم کیمیا وغیرہ ہو ان

تمام علوم کا مبداء ادارک بالحواس (Percepts) اور عقل (Concepts) ہیں۔ اب اگر مشاہدہ یا ادراک ہی درست نہیں ہوگا تو لازمی طور پر تصورات بھی غلط ہوں گے اور نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ پورا علم ہی مشکوک ہو جائے گا جس کی وجہ سے تشویش اور غیر محفوظیت کے زیر اثر مریضانہ ذہنی کیفیت خارجی اشیاء خارجی عوامل اور حقائق کو ان کی صحیح نوعیت اور ان کے صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے سے قاصر ہوگی۔ کیونکہ ان نفسیاتی مریضوں کا ذہنی ادراک مسخ شدہ صورتوں میں ہوتا ہے۔

ہمیں دِلوں کی ان بیماریوں یا ذہنی ونفسیاتی عوارض کا مشاہدہ کرنے کے لئے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں ڈر، خوف، تشویش، غیر محفوظیت اور دیگر خطرات کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام بیماریاں مثلاً جذباتی گھٹن، مریضانہ جذباتیت، ذہنی کشمکش، دماغی خلل، دماغی عارضے، غیر مہذب کرداری خلل، جنسی عوارض، منشیات کا بے دریغ استعمال، شخصیاتی خلل، خبط، اجبار جیسے کئی دوسرے نیوراتی یا عصباتی اور ذہنی اختلالی عوارض پورے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ 19 اگست 2013ء کو دنیا میں یوم اِنسانیت (Humanitarian Day) منایا گیا۔ اس ضمن میں ''وائس آف امریکہ'' سے پاکستان کے بارے میں نشر ہونے والے ایک پروگرام میں بتایا گیا تھا کہ ملک میں جاری دہشت گردی، لوٹ مار، حکومتی سطح پر بددیانتی وناانصافی، زخیرہ اندوزی اور ہوشربا مہنگائی کے عفریت کی وجہ سے شہریوں کے ذہنی اختلال (Psychoses) میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ B.B.C کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ملک میں اغوا برائے تاوان کے کاروبار نے ایک منافع بخش انڈسٹری کی صورت حاصل کر لی ہے۔ یہ ایسے واضح حقائق ہیں جنہیں محض پراپگنڈا کہہ کر نظر انداز کر دینے سے مزید خرابی ہوگی۔

نیوراتی وذہنی امراض میں تشویش و بے جا خوف کے علاوہ چند بیماریاں اور بھی ہیں۔ ان میں ایک خبط (Obsession) کی بیماری ہے جس کا تعلق انسان کی سوچ وخیالات سے ہے۔ ایک عام آدمی کے ذہن میں غیر ارادی طور پر خیالات آتے رہتے ہیں۔ لیکن انسان کے ذہن میں اگر ایک ہی سوچ یا خیال بار بار آئے اور وہ چاہنے کے باوجود اس سوچ کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکے تو ایسے شخص کو نفسیات کی سائنسی اصطلاح میں خبطی (Obsessional) شخص کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات وارد ہونے والے خیالات ڈراونے بھی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات بالکل لغو اور بے سروپا بھی۔ بروقت مناسب علاج نہ ہونے کی صورت میں یہ مرض اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ اس مرض کا شکار دوسرا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایک اور نیوراتی مرض جس کا تعلق انسانی کردار سے ہے جسے نفسیاتی اصطلاح میں اجبار (Compulsion) کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں مبتلا شخص کوئی ایک حرکت یا ایک سے زائد حرکات بار بار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مثلاً بار بار صابن سے ہاتھوں کو دھونا، بجلی کے بٹن کو بار بار اوپر نیچے کرنا۔ بار بار پاؤں دھونا، کپڑوں کو بار بار استری کرنا اور کھانے کے برتنوں کو بار بار دھونا وغیرہ وغیرہ۔ وہ شعوری طور پر جانتا بھی ہے کہ اس کے یہ اعمال بے معنی اور لغو ہیں لیکن وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ عمل کوئی بیرونی یا انجانی قوت اس سے سرانجام دلوا رہی ہے۔ ایک اور مرض اختناق (Hysteria) ہے۔ اس بیماری کی بہت سی مختلف علامات ہیں، I.C.D-9 کے تحت اختناق کی تمام مختلف علامات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے گروہ میں شامل علامات کو افتراقی ردِعمل (Dissociative reaction) کا نام دیا

گیا ہے جس میں حافظہ کھونا (Amnesia) نسیان گردی (Fugue) اور کثیر تعداد شخصیت جیسے امراض شامل ہیں۔ اور دوسرے گروہ میں شامل علامات کو تحویلی اختناق (Conversion hysteria) کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ضعفِ اعصاب (Neuras Thenia) سودا (Hypochondria) نیوراتی اضمحلال (Neuratic Depression) اعدام شخصیت (Depersonalization Syndrome) اور دیگر ذہنی اعمال (Other Neurotic Disorders) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ذہنی اختلال (Psychosis) کے امراض بھی ہیں جن میں انشقاق ذہنی (Schizophrenia) کی آٹھ قسمیں، تحسیسی اختلال ذہنی کی چار اقسام اور دیگر کئی امراض شامل ہیں۔

نفسیاتی بیماریوں کی کئی اور اقسام بھی ہیں جن کا آگے مناسب موقعہ پر تذکرہ ہوتا رہے گا۔ یہاں پر مناسب ہے کہ ان کتابوں کا ذکر کر دیا جائے جن سے نفسیات کے بارے میں زیادہ تر مواد لیا گیا ہے۔ ان میں ایک کتاب ''نفسیات'' کے نام سے ہے جسے چار ماہرین نفسیات حمیرا ہاشمی، ناصرہ فاروق، رفیق جعفر اور عبدالحمید نے مرتب کیا ہے اور اردو سائنس بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مرتبین کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں نفسیات سے متعلق تمام موضوعات کے علاوہ نیا اور تجرباتی مواد، نیز نفسیات کے جدید رجحانات اور موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نفسیات پر ایک بہت ہی اہم اور مفید کتاب پروفیسر ساجدہ زیدی کی ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز'' ہے۔ آپ پروفیسر، نفسیات اور تخلیقات کی ایکسپرٹ ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم سے صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئی تھیں۔ اس کتاب میں ''نفسیاتی عمق کے آئینے میں انسانی شخصیت کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فرائیڈ، ژنگ اور نوفرائڈی ماہرین نفسیات کے نظریات کی تعبیر اور تنقیدی تجزیئے کی روشنی میں انسانی عمل، جذبہ اور محرکات اور انسانی شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور کی پراسرار دنیا سے پردہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے''۔ ایک اور کتاب ''تعلیمی نفسیات'' کے نام سے ہے جس کے مؤلف ڈاکٹر محمد عالم ضیاء ہیں اور ملک محمد موسیٰ اور شازیہ رشید کی تالیف کردہ کتاب ''تعلیمی نفسیات'' بھی میرے سامنے ہے۔ اور ایک اہم کتاب ''فرائیڈ کی نفسیات'' از شہزاد احمد۔

نفسیات اور اخلاقی اقدار یا عقائد (کسی قسم کے بھی ہوں) کا بھی آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اقدار مطلق ہونے چاہئیں یا اضافی اور ان کا سرچشمہ موضوعی یعنی خود انسان ہے یا معروضی یعنی انسان کو یہ اقدار کہیں خارج سے ملتے ہیں؟ ان موضوعات پر فلاسفہ، سائنسدانوں، ماہرین حیاتیات اور نفسیات میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ انسان ایسا وجود ہے جو صاحب اختیار ہے اس لئے وہ صداقت و اخلاقی اقدار کا خود موجد ہے۔ اقدار کے لئے اسے کہیں باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک معروضی اندازِ فکر انسانی شخصیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ حق وہی ہے جو موضوع کے لئے حق ہے۔ ایسا نظریہ رکھنے والوں کا زیادہ تر تعلق موجودیت پسندی (Existentialism) کے نظام فکر سے ہے۔ اکثر ماہرین اور فلسفی اسے ''وجودیت'' کہتے ہیں جو علی عباس جلالپوری کے نزدیک غلط ہے وہ کہتے ہیں کہ وجود 'Being' کا ترجمہ ہے Existence کا ترجمہ ''موجود'' ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں وجودیت سے مراد وحدت الوجود یا ہمہ اوست ہے۔ اس مکتبہ فکر کے اکثر ترجمان قنوطیت پسندی کا شکار تھے۔ کیرک گرد کو

موجودیت کا بانی سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے بعض افکار کی پیش قیاسی پاسکل (م 1662ء) نے کی تھی۔ وہ مریضانہ حساسیت' آشفتہ سری اور یاسیت کے باعث خود زندگی سے ہی تنگ تھا۔ اس کا اپنی منگیتر سے جھگڑا ہو گیا تو لڑکی نے کہا مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کیرک نے کہا ''ایک شریف اور غیور آدمی سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن ایک بات ناقابل برداشت ہے۔ اور وہ ہے رحم''۔ وہ دہشت (The concept of dread) کا نفسیاتی اور مذہبیاتی تجزیہ کرتے ہوئے دہشت اور خوف میں فرق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خوف تو کسی نہ کسی شئے یا فرد کا ہوتا ہے اور دہشت کا تعلق انسان کے آزادی عمل کی پیداوار ہے۔ جب انسان آزادانہ عمل کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہ دہشت کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر گناہ کے ارتکاب سے قبل دہشت لازماً موجود ہوتی ہے۔ کیرک بھی معروضیت کے مقابلے میں موضوعیت کو حق وصداقت سمجھتا ہے۔ ''ایک موجود متنفس صرف اپنی موجودگی کا ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ موضوع اسی موضوعیت ہی میں کھو جائے' وہ واضح اعلان کرتا ہے کہ ''میرا انتخاب اور فیصلہ شخصی ہے کوئی ذات مطلق میرے لئے کسی قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار وارادہ دیا ہوا ہے لیکن یہ کہنا تو مبالغہ آرائی کے زُمرے میں آتا ہے کہ ''موضوع ہی حقیقت ہے اور حقیقت ہمیشہ موضوع ہی میں ہوتی ہے''۔ کیرک کا خدا اپنے وجود کے لئے انسانی موضوع یا موجودگی کا محتاج ہے۔

سورین کیرک گرد کے نزدیک سائنس جو معروضی استدلال سے کام لیتی ہے غلط ہے کیونکہ صرف موضوعی اندازِ فکر سے انسانی مسائل اور عقدوں کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے زندگی کو کھوکھلی اور لغو قرار دے کر ستر سال زندہ رہ کر انتظار کرنے کے بجائے مشورہ دیا ہے کہ ''کیوں نہ اس زندگی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے''۔ زندگی کے بارے میں اس نوع کی تحریروں سے بعض ماہر نفسیات نے اسے ''پژمردگی کے جنون'' (Affective Psychosis) کا مریض قرار دیا ہے۔

جبریل مارسل ہائی ڈگر اور ژاں پال سارتر بھی کیرک کے مقلدین میں سے ہیں۔ سارتر 1905ء میں فرانس میں پیدا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو وہ بھی لغو اور بے معنی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ''اپنے آپ کو معنویت عطا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ عدم سے کامل آزادی کا اقدام کیا جائے۔ چنانچہ انسان کی آزادی اس کے ذات کے عدم سے ہی معرضِ وجود میں آتی ہے''۔ اس کے خیال میں عدم ہی وجودِ مطلق ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''میں وہ ہوں جو نہیں ہوں اور میں نہیں ہوں جو ہوں''۔ اس طرح سارتر کی مابعد الطبعیات میں منفی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ انسان پسندی (Humanism) کو سب سے بڑی قدر سمجھتا ہے۔ اسی انسان دوستی کو سامنے رکھ کر وہ کہتا ہے یہی ہمارا ہیومنزم ہے جس سے ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ سوائے انسان کے کوئی اس کے لئے قانون نہیں بنا سکتا''۔ نیز یہ کہ ''ہم نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا ہے تا کہ انسان خود انسان کے لئے وجود مطلق بن جائے''۔ سارتر کی یہ بات بڑی اہم اور دور رس نتائج کی حامل ہے حقیقت میں انسان خدا' وحی اور انبیاءؑ کا انکار کرتا ہی اس لئے ہے کہ اسے اپنے سے کمزور اور بے بس انسانوں پر ظلم وستم توڑنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔ اس میں انسانی نفسیات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ سارتر نے کہا ''میری آزادی یہ معلوم کر کے آزادی سے دوچار ہوتی ہے کہ یہ قدروں کی ایسی بنیاد ہے جس کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے''۔ اس پر علی عباس یوں تنقید کرتے ہیں۔ ''یہ بات موجب حیرت ہے کہ آزادی کا وہ تصور جس کی اپنی کوئی بنیاد نہ ہو قدروں کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے''۔

ان فلاسفہ سے پہلے والٹیئر' لامتری' دیوروا اور ہولباخ وغیرہ نے عقل وخرد اور سائنس پر کامل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا تھا کہ چونکہ عقل انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اس لئے تنہا عقل ہی تہذیب وتمدن کی اساس ہے۔ بات کسی حد تک درست ہے لیکن خود تعقل (Mental Process) ابھی تک اِرتقائی منازل میں ہے اس لئے یہ حق وباطل' خیر وشر اور غلط یا صحیح کا معیار نہیں بن سکتا۔ ارادیت پسندی کا مشہور شارح فریڈرک نطشے 1844ء بھی یہی کہتا ہے کہ ''صداقت اٹل امر نہیں بلکہ اضافی اور تغیر پذیر ہے''۔ خیر وشر کا معیار یہ ہے کہ ''جو کچھ بھی قوت سے ظاہر ہو وہ خیر ہے اور جو کمزوری سے ظاہر ہو وہ شر ہے''۔ وہ اپنی ایک تصنیف ''بقولِ زردشت'' میں کہتا ہے۔ ''خدا مر چکا (نعوذ باللہ) ایسا فوق الانسان خدا تیرا سب سے بڑا خطرہ تھا۔ وہ قبر میں گیا تم اُٹھ بیٹھے''۔ دوسرے رومانیوں یا ارادیت پسندوں کی طرح نطشے کا اساسی خیال بھی یہی ہے کہ ''جذبات ہمارے لئے نصب العین معین کرتے ہیں اور عقل ان کے حصول کے لئے وسائل فراہم کرتی ہے''۔ خود ہماری درس گاہوں میں بھی اقدار کو جذبات اور رویوں کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے (تعلیمی نفسیات صفحہ 89) جذبات پر بحث آگے آئے گی۔ اقدار کے سرچشمے کے بارے میں سوفسطایہ کا بھی یہی نظریہ تھا کہ ان کو انسان خود متعین کرتا ہے۔ یہ ایک مختصر سا جائزہ اس مکتبہ فکر کا ہے۔ جو انسانی تہذیب وتمدن یا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے کسی قسم کی بھی خارجی راہنمائی کو ضروری نہیں سمجھتے وہ قطعی طور پر اس کے منکر ہیں۔ ان کے برعکس ان فلاسفہ' سائنسدانوں یا دانشوروں کا ایک مکتبہ فکر ہے جو انسان کی راہنمائی کے لئے خارج سے ہدایت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے ذِکر سے پہلے مناسب ہے کہ قرآن پاک کا مؤقف بھی میں اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق بیان کردوں۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک قدیم یونانی فلاسفہ کا طریق کار قیاسی (Deductive) تھا۔ یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہے جن پر زندگی کے علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا علامہؒ کے نزدیک اسلام کا ظہور عقل استقرائی اور تجرباتی (Inductive and Experemental) کا ظہور ہے۔ عقل کے تجرباتی طریق کے بارے میں علامہ پرویز لکھتے ہیں۔ ''نزول قرآن کے بعد عقل کے اس تجرباتی طریق 41:53 کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے' وسائلِ نشر واشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے قرآنی حقائق بھی فضائے عالم میں عام ہو چکے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فکر' شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے متاثر بھی ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اپنے تجربات سے پہلے' جس مقام تک صدیوں میں جا کر پہنچتی تھی اب وہ نسبتاً قلیل ترین عرصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا (جیسا کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر مشتمل اپنی تصنیف ''معراج انسانیت'' میں لکھا ہے) علیٰ رؤس الاشہاد کہا جا سکتا ہے کہ بزم ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدق' اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہین منت ہے۔ ع

ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبو..... آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست..... یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

اقدار اور احکامات کے بارے میں قرآنِ کریم میں بنیادی اصول یہ دیا گیا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی بھی صاحبِ اقتدار نہیں اس لئے اسی کی طرف سے دیئے گئے احکامات اور اقدار کی محکومیت اختیار کی جائے۔'' ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے جس میں خود تمہارے شرف وعظمت کا راز پوشیدہ ہے اگر تم ذرا عقل وبصیرت سے کام لے کر اس کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس پر عمل اس کی پیروی کرنے سے تمہیں بلندیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں گی۔ اور اگر اس کے بتائے ہوئے احکامات کی خلاف ورزی کی تو تم بھی اسی طرح تباہ وبرباد ہو جاؤ گے' جس طرح ہم نے تم سے پہلے کتنی ہی قوموں کو برباد کر دیا 21:10-11''۔ ہر طرف سے کٹ کر اسی کے احکامات اور قوانین کی پیروی کرو۔ اس کی اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قوانین و فیصلے شامل نہ کرو یعنی شرک نہ کرو' 30:31''۔ ''تمام اختلافی امور کے فیصلے احکاماتِ الٰہی کے مطابق کرو 4:105''۔ ''نوعِ انسانی کے لئے ضابطہ خداوندی سے بہتر اور کوئی ضابطہ قوانین نہیں 5:50''۔ ''خدا کا قانون اس قدر بلند اور عظیم المرتبت ہے کہ کوئی اور قانون اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا 31:30''۔ جو لوگ قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ ہر قسم کی تخریب سے محفوظ بھی رہتے ہیں اور انہیں ان کی محنت کے بھرپور نتائج بھی ملتے ہیں۔ یہ قانون سرتاپا حقیقت وصداقت پر مبنی ہے قرآن پاک میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جو انسانوں کی راہنمائی کے لئے ضروری ہے 32-35:30''۔ وہ الصلوٰۃ کو قائم (Establish) کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں قوانین خداوندی کے تحت حاصل ہوتا ہے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھتے ہیں 2:3۔ یعنی صلاۃ اور معاشیات میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسلام کے مطابق جہاں بھی مسلمان اقتدار میں ہوں وہاں انسانی معاملات سے متعلقہ اور غیر متعلقہ تمام شعبے قرآنی اصول واحکامات کے مطابق ہونے لازمی ہیں 22:41' 24:55۔ اسی لئے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا تذکرہ زیادہ تر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اجتماعی معاملات میں باہمی مشاورت کا حکم بھی اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ منسلک ہے۔ 42:38۔ الصلوٰۃ اور معاشیات کے باہمی تعلق کو حضرت شعیبؑ کے تذکرے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے جہاں منکرین ان کی نماز پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال ودولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔ بڑی عجیب نماز ہے'' 11:87۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹی جس کی عمر 27 سال ہے۔ تعلیم ایم۔اے اور مناسب قد وقامت کی حامل ہے' کے لئے موزوں رشتہ' ترجیحاً قرآنی فکر اور جٹ فیملی سے مطلوب ہے۔ ضرورت مند احباب درج ذیل نمبر پر رابطہ فرما سکتے ہیں۔ رابطہ 0304-0086248

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط دوم

پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت

حدیث صرف وہی صحیح ہے جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہو کیونکہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضور کریم ﷺ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف ہوسکتا ہے۔ البتہ حدیث وسُنّت' وحی یا وحی کی کوئی قسم نہیں' کیونکہ وحی کے صحیح اور غلط ہونے کو تو زیر بحث لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ احادیث وسُنّت کی صحت ہمیشہ زیر بحث رہی ہے۔

معیارِ حدیث؟۔ قرآن نہ کہ انسان:۔ قرآن کریم ہر تصور، ہر نظریہ اور ہر عمل کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا عالمگیر معیار ہے۔ کسی حدیث یا سنت (عملِ رسول ﷺ) کی صحت کا معیار بھی قرآن کریم ہے۔ جو روایت بطور حدیث وسنت انسانوں (اسماء الرجال) کی شہادتوں کی بناء پر ضعیف یا غیر صحیح سمجھی جاتی ہے، اگر وہ خلافِ قرآن نہ پائی جائے تو وہ دراصل صحیح اور قوی حدیث قرار پائے گی۔ جبکہ ایک روایت جسے انسانی شہادتوں کی بناء پر قوی اور صحیح قرار دیا جاتا ہے، اگر وہ خلافِ قرآن پائی جائے تو اُسے کسی صورت میں حدیث یا سنتِ رسول ﷺ تسلیم نہیں کیا جا سکتا، خواہ اُس کے بارے میں کہا جائے کہ کسی ''مزاج شناسِ رسول (ﷺ)'' یا ثقہ راویان کی ایک کثیر تعداد نے اسے تواتر سے بیان کیا اور صحیح قرار دیا ہے کیونکہ معیارِ صحت کسی انسان کی ذاتی رائے یا انسانوں کی اکثریت یا اقلیت یا تواتر وغیرہ نہیں بلکہ اعلیٰ ترین معیارِ صحت قرآن کریم ہے (موءلف)۔

(مولانا) ابوالکلام آزاد:۔ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۴ء۔ص۔۶۳۔ ''روایات کے متعلق صحیح موقف وہی ہے جسے (مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔ ''روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی

جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہوجائے گی۔'' (ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ ص۔ ۵۰۰۔ شائع کردہ مکتبہ برہان۔ دہلی)۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کا عقیدہ:۔ طلوعِ اسلام جون ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۴۵:۔ ''قرآن کریم جناب رسول ﷺ سے تواتراً منقول ہے۔ یعنی اس کو نقل کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر نفوسِ کثیر رہے جن میں جھوٹ بولنے یا غلطی کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس لئے قرآن کریم کا منکر کافر ہے اور اس کو ماننا عقلاً و نقلاً ضروری ہے۔ اس کے ماسوا اور احادیث خواہ قدسیہ ہوں یا غیر قدسیہ، ان کے نقل کرنے والے اتنے کثیر نفوس نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں عقلاً غلطی یا جھوٹ کا آنا ممکن ہے۔ اس لئے یہ قطعی الثبوت نہ ہوگی اور ان کا منکر کافر نہ ہوگا۔'' (مکتوب شیخ الاسلام حسین احمد مدنی صاحب۔ جلد اول۔ ص۔ ۱۰۰۔ مطبوعہ استقلال پریس لاہور)۔

مولانا سندھی (مرحوم):۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۴۵:۔ ''صحیح احادیث کی موجودگی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ حضرات ''سنت'' کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کرسکیں۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کے پاس احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قطعاً نہیں۔ احادیث کے بے شمار مجموعے ہیں۔ مولانا سندھی (مرحوم) کے الفاظ میں:۔ میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں۔ جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں۔ تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔ (مقامِ حدیث۔ جلد اول۔ پہلا ایڈیشن۔ ص۔ ۲۴۹)۔''

علامہ شبلی نعمانیؒ:۔ ہندوستان کے عالمی شہرت یافتہ محقق مؤرخ علامہ شبلی نعمانیؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُنہوں نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''الفاروق'' کے باب ''امامت اور اجتہاد'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث کے بارے میں کس قدر احتیاط برتتے تھے:۔ ''میں اس موقع پر خود کچھ نہ لکھوں گا بلکہ بڑے بڑے محدثین نے جو کچھ لکھا اس کو نقل کرکے لفظی ترجمہ کروں گا۔ علامہ ذہبی نے جن سے بڑھ کر ان کے بعد کوئی محدث نہیں گزرا اور جو حافظ ابن حجر و سخاوی وغیرہ کے شیخ الشیوخ ہیں تذکرۃ الحفاظ میں حضرت عمرؓ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:۔ (عربی متن دیا ہوا ہے، یہاں صرف ترجمہ دیا جا رہا ہے)۔ یعنی حضرت عمرؓ اس ڈر سے کہ صحابہؓ آنحضرت ﷺ سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں، صحابہؓ کو حکم دیتے تھے کہ رسول ﷺ سے کم روایت کریں تاکہ لوگ حدیث میں مشغول ہوکر قرآن کے یاد کرنے سے غافل نہ ہوجائیں۔ قرظہ بن کعب سے روایت ہے کہ جب عمرؓ نے ہم کو عراق روانہ کیا تو خود مشایعت کو نکلے اور کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہارے ساتھ ساتھ آتا ہوں؟۔ لوگوں نے کہا ہماری عزت بڑھانے کو۔ فرمایا ہاں،

لیکن اس کے ساتھ یہ عرض بھی ہے کہ تم لوگ ایسے مقام میں جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آواز شہد کی مکھیوں کی طرح قرآن پڑھنے میں گونجتی رہتی ہے تو اُن کو احادیث میں نہ پھنسا لینا۔ قرآن میں آمیزش نہ کرو، اور رسول ﷺ سے کم روایت کرو۔ اور میں تمہارا شریک ہوں۔ بس جب قرظہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے کہا کہ حدیث بیان کیجئے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ نے ہم کو منع کیا ہے۔ ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ آپ عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی طرح حدیثیں روایت کرتے تھے؟۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کرتا تو عمرؓ مجھ کو دُرّے مارتے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ، ابودرداءؓ و ابومسعودؓ کو محبوس کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے بہت حدیثیں روایت کرنی شروع کیں۔'' حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔ ''علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت ابوبکر کے حال میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے احادیث کے باب میں احتیاط کی وہ ابوبکرؓ تھے۔ علامہ موصوف نے حاکم سے یہ بھی روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے 500 حدیثیں قلم بند کی تھیں لیکن پھر ان کو آگ میں جلا دیا اور کہا کہ ممکن ہے کہ میں نے ایک شخص کو ثقہ سمجھ کر اس کے ذریعہ سے روایت کی ہو اور وہ درحقیقت ثقہ نہ ہو۔''

علاّمہ اقبالؒ اور حدیث:۔ پرویز صاحب علاّمہ اقبالؒ کے نظریات سے متاثر ہیں۔ وہ حدیث کے بارے میں بھی فکرِ اقبال سے استفادہ کرتے ہیں۔ فقہ کے بارے میں اقبالؒ کے مشہور خطبہ کا ذکر کرنے کے بعد ''احادیث کی قانونی حیثیت'' پر لکھتے ہیں:۔ ''یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جراءت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علاّمہ اقبالؒ کو اس قسم کی جراءت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:۔

احادیث کی قانونی حیثیت:۔ ''احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے۔ اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہء قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرمایا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اُس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ

وہ عالمگیر اصول عطا کردے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا، پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام، اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابوحنیفہؒ:۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے اُن کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہوچکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ اِن حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق، جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اُس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا، جن کا شمار فقہاءِ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔'' احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علاّمہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرم ﷺ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے متعلق حضور ﷺ کو حکمِ خداوندی تھا کہ:۔ **شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:159)۔ ''ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔'' اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ ''وحی'' کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہوسکتے۔ حضور ﷺ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے مشورہ سے طے فرمایا اور حضور ﷺ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ:۔ **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38)۔ ''یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔'' یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی اور غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ

رہنے کے بعد پیدا ہوا۔ احادیثِ رسول اللہ ﷺ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور اُن سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔۔۔ اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔ اور ''قیاس'' کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ ''قیاس'' سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رو سے اُس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔۔۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں: ''انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآب ﷺ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے اُن کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ اُنہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔'' اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ: ''لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآب ﷺ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔'' (طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۷۸ء۔ صفحہ نمبر ۳۰۔۲۸)۔

جسٹس عبدالرحیم:۔ ۱۹۱۱ء میں مدراس ہائی کورٹ کے جج جناب عبدالرحیم (مرحوم) نے اپنی مشہور انگریزی کتاب (محمڈن جورس پروڈنس) میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں (ص۔۲۵ پر) لکھا کہ:۔ ''کہا جاتا ہے کہ انہوں (امام صاحب) نے اُس وقت کے مروّجہ (بہت بڑے) ذخیرہء احادیث میں سے صرف اٹھارہ (۱۸) احادیث پر عمل کرنے کو (Felt justified) مناسب اور صحیح محسوس کیا۔'' (موءلف)۔

محترم غامدی صاحب:۔ طلوعِ اسلام اگست ۲۰۱۳ء۔ ص۔۴۱:۔ ترکی کے اہلِ علم حدیث کی کتابوں پر نئے سرے سے نظر ڈال کر صحیح اور غلط احادیث کو الگ الگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر اہلِ علم حضرات اپنے اپنے تبصرے کر رہے ہیں۔ محترم جناب جاوید احمد غامدی صاحب (موجودہ دور کے ایک روشن خیال عالم اور موءلف کے اُستادِ محترم) نے روزنامہ ''دنیا لاہور'' مورخہ ۲۸۔ جون۔ ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں ''ترکی میں حدیث کی تدوینِ جدید'' کے عنوان سے اپنی رائے دی ہے کہ:۔ حضور کریم ﷺ کا

اسوہء حسنہ'' ہم تک کس طرح پہنچا ہے؟۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسے حدیثوں کی صورت میں سب سے پہلے صحابہؓ نے لوگوں تک پہنچایا۔ پھر جن لوگوں نے یہ حدیثیں اُن سے سنیں، انہوں نے دوسروں کو سنائیں۔ یہ زبانی بھی سنائی گئیں اور بعض اوقات لکھ کر بھی دی گئیں۔ ایک دو نسلوں تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا لیکن پھر صاف محسوس ہونے لگا کہ ان کے بیان کرنے میں کہیں کہیں غلطیاں ہو رہی ہیں اور کچھ لوگ دانستہ ان میں جھوٹ کی ملاوٹ بھی کر رہے ہیں۔ یہی موقع ہے، جب اللہ کے کچھ بندے اٹھے اور انہوں نے ان حدیثوں کی تحقیق کرنا شروع کی۔ انہیں، محدثین کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے غیر معمولی لوگ تھے۔ انہوں نے ایک ایک روایت اور اُس کے بیان کرنے والوں کی تحقیق کر کے جس حد تک ممکن تھا، غلط اور صحیح کی نشان دہی کی اور جھوٹ کو سچ سے الگ کر دیا۔ پھر انہی میں سے بعض نے ایسی کتابیں بھی مرتب کر دیں جن کے بارے میں بڑی حد تک اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، وہ بیشتر حضور ﷺ ہی کا علم ہے جو روایت کرنے والوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ علم کی زبان میں انہیں 'اخبارِ آحاد' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں صرف گنتی کے لوگوں نے بیان کیا ہے، قرآن وسنت کی طرح یہ اجماع اور تواتر سے منتقل نہیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ، بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ درجہء یقین کو نہیں پہنچتا، اُسے زیادہ سے زیادہ ظنِ غالب قرار دیا جا سکتا ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب اپنی جگہ اہم ہیں، مگر امام مالکؒ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت مستند خیال کی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑی تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ تاہم اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے مرتب کرنے والوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اس علم کے ماہرین جانتے ہیں کہ اُن سے تحقیق میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اسی بناء پر وہ حدیث کی کتابوں کو برابر جانچتے پرکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی حدیث کے بیان کرنے والوں کو اگر سیرت و کردار اور حفظ و اتقان کے لحاظ سے قابل اعتماد نہیں پاتے یا آپس میں اُن کی ملاقات کا امکان نہیں دیکھتے یا اُن کی بیان کردہ حدیث کے مضمون میں دیکھتے ہیں کہ کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف ہے یا علم و عقل کے مسلمات کے خلاف ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ آنحضرت ﷺ کی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ غلطی آپ ﷺ کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ یہی معاملہ ان حدیثوں کے فہم اور ان کی شرح و وضاحت کا ہے۔ اہلِ علم اس معاملے میں بھی اپنی تعبیرات اسی طرح پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں علامہ ناصر الدین البانی نے اس سلسلے میں بڑی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور حدیث کی اکثر کتابوں پر ازسرِ نو تحقیق کر کے اُن کے صحیح اور سقیم کو ایک مرتبہ پھر الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔'' اس کے بعد غامدی صاحب ترکی کے اہلِ علم کی اس کوشش کو سراہتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ احادیث کس طرح جمع ہوئیں ان کی کیا کیفیت ہے اور وہ کس حد تک محفوظ ہیں؟۔

دوسری طرف، قرآن اور حدیث کی حیثیت برابر:۔ طلوع اسلام اگست ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۵۵:۔ ''یہ ہے احادیث کی صحیح پوزیشن۔ لیکن ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ: ''تحقیق وتثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا۔۔ جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہء سنت کی

تصریحات کے مطابق صحیح ہوں۔۔۔ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔۔۔بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے۔۔۔ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔'' (جماعتِ اسلامی کا نظریہء حدیث۔از مولانا محمد اسماعیل مرحوم۔سابق صدر مرکزی جمعیت اہل حدیث۔صفحہ نمبر ۴۵۔،۵۵)۔یعنی بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور ملت کے دائرے سے خارج قرار پاتا ہے۔(مثلاً) بخاری کی ایک حدیث ہے کہ ''جب ملک الموت، حضرت موسیٰ کی جان قبض کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے اسے ایسا تھپڑ مارا کہ وہ لوٹ کر خدا کے پاس چلا گیا۔'' (کتاب الانبیاء)۔اگر آپ اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کر دیں، تو (مذکورہ بالا فیصلہ کی رو سے) آپ دائرہء اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔''

شرک:۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور کچھ فرقے (دیوبندی، اہل حدیث وغیرہ) بڑی شدومد سے اس عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی صورت میں کسی بھی قسم کی ہمسری شرک اور کفر ہے (حتیٰ کہ حضور کریم ﷺ کو بھی کسی بھی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا ہمسر قرار نہیں دیا جا سکتا) لیکن یہ حضرات اس امر پر غور نہیں کرتے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام اور قانون ہے۔اس کلام اور قانون کے مقابلے میں کسی اور قانون وکلام کو اس کے برابر قرار دینا (خواہ اُسے حضور کریم ﷺ ہی سے منسوب کیوں نہ کیا جائے) شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ (موءلف)۔

☆.....☆.....☆

قرآن مکمل دین نہیں:۔ طلوع اسلام مارچ ۱۹۷۸ء۔ص:۔۵۲۔''ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم دین کا مکمل ضابطہ نہیں۔حدیث کی پوزیشن مثلہٗ معہٗ کی ہے۔۔یعنی قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ۔مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں:۔''حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسّر کی ہے۔یعنی وہ انہی مسائل ووقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔۔۔مسائل واحکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔(ترجمان القرآن۔جولائی۔اگست۔ستمبر ۱۹۵۰ء)۔اس مقام پر مودودی صاحب سے پوچھا گیا کہ جب دین کی تکمیل قرآن اور حدیث، دونوں کے مجموعے سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں، قرآن ہی میں کیوں نہ بیان کر دیا تا کہ امت کے پاس دین کا مکمل اور محفوظ ضابطہ موجود ہوتا۔اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔''اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد، باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔'' (تفہیمات۔حصہ اول۔ص۔۳۳۷)۔یہ بات غور طلب ہے کہ کیا احادیث کے مجموعے (صحاح ستہ وغیرہ) جنہیں مبنی بر وحی (خفی) اور ماخذِ سنت مانا جاتا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے کم ضخیم ہیں؟۔مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ:۔موءلف (مولانا محمد اسلم جیراج پوریؒ) کی غلطی کا اصل سبب

یہ ہے کہ انہوں نے ''صرف قرآن'' سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے (تفہیمات۔حصہ دوم۔ص۔۲۹۲)۔

طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۳۵:۔ ''احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ ''وحی خفی'' ملی تھیں۔اس لئے یہ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہٗ)۔اتنا ہی نہیں، ان کے متعلق یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔کراچی کے ''ادارہ تحقیقِ حق'' کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے ''فتنہ انکارِ حدیث''۔اس کے مصنف ہیں ''علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی''۔وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں:۔اگر کوئی کہے کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (5:48) کے کیا معنی ہیں۔نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ''ما انزل اللہ'' کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔بلکہ ''ما انزل اللہ'' کتاب اللہ بھی ہے اور حدیثِ رسول اللہ بھی۔(صفحہ نمبر ۵۲)۔اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

حدیث، قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے:۔ رہی یہ بات کہ قولِ رسول ﷺ قرآن کے خلاف ہو تو بھی حجت ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (2:180)۔تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے۔اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا وصیۃ للوارث۔وارث کے لئے وصیت نہیں اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسول ﷺ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔(صفحہ نمبر ۸۵)۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول ﷺ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول ﷺ کا قول قرآن کو فسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسول ﷺ کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول ﷺ کا قول بھی خدا کا قول ہے۔اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے، اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسول ﷺ) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔(صفحہ نمبر ۸۶)۔(نجانے شرک اور کسے کہتے ہیں؟)۔۔ہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرنِ اول (عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ کے ذخیرہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں۔جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں، انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔جو اس کے خلاف ہوں، انہیں مسترد کر دیا جائے۔اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا:۔

قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو سکتا ہے:۔ جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔بالکل اسی طرح نبی ﷺ کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔اس لئے کہ نبی ﷺ کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔قرآن بھی اور حدیثِ رسول بھی۔تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری

نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیثِ رسول ﷺ کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے (صفحہ نمبر ۵۱)۔

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے:۔ یکثر لکم الاحادیث من بعدی۔ فاذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ۔ فما وافق فاقبلوہ۔ وما خالف فردوہ۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح۔ صفحہ نمبر ۴۸۰)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرلو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو'' اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا کوئی ارشاد قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟۔ جماعتِ اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ ''رحیق'' نے اپنی اپریل ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہئے۔ یہ عقیدہ ملحدوں کا ہے:۔ اس حدیث کو ملحدوں نے وضع کیا تھا اور انہی ملحدوں کے خیالات کی خوشہ چینی بکواس ازم کے یہ ممبران کر رہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں: وضعہ الزنادقۃ الذین مقصودھم افساد الدین ویدفعہٗ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم انی اوتیت الکتاب ومثلہٗ معہٗ۔ (ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی۔ صفحہ نمبر ۲۶۷)۔ یعنی ''یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کردینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کردینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے خود بخود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس ''حدیث'' ہی قرآن کے مانند ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ ''قرآن کے مانند'' کا نام ''حدیث'' ہے۔ وہ روایت یہ ہے: لا الفین احدکم متکئاً علیٰ اریکتہٖ یصل الیہ عنی الحدیث فیقول لانجد ھذا الحکم فی القرآن الا وانی اوتیت القرآن ومثلہٗ معہٗ (ظفر الامانی صفحہ نمبر ۲۶۷)۔ دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: لیوشک الرجل متکئاً علیٰ اریکتہٖ یحدث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ الحدیث۔ (دارمی۔ صفحہ نمبر ۱۴۰۔ جلد اول طبع مصر)۔ اس قسم کی روایات الکفایہ (ص۔ ۱۰۰۹) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند ''حدیث'' بھی دی گئی ہے۔ امام خطابیؒ کی طرح امام شافعیؒ۔ امام المحدثین عبدالرحمانؒ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی

فرمایا ہے کہ جو روایت سنتِ نبویہ ﷺ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے، وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد جلد اول۔ ص۔ ۶۸)۔ یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو، اسے صحیح سمجھو، جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دو، (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے:۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے، آپ کا حسنِ کرشمہ ساز، کرے۔''

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہماری کتبِ احادیث و سیر میں ایسی باتیں موجود ہیں جو:۔ (۱)۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ (۲)۔ جن سے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔ (۳)۔ جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔ (۴)۔ جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔''

منکرینِ قرآن:۔ غلط قسم کی، خلافِ قرآن روایات (خصوصاً ایسی روایات جن سے حضور کریم ﷺ یا اُن کے صحابہ کرامؓ کی توہین و تضحیک کا کوئی پہلو نکلتا ہو) کا انکار کرنے والوں کو تو بلا جواز ''منکرینِ حدیث'' کے لقب سے نوازا جاتا ہے، مگر کیا قرآن کریم کو اس کا حقیقی مقام نہ دینے اور احادیث کو قرآن کے برابر قرار دینے بلکہ قرآن پر احادیث وغیرہ کو ترجیح دینے والوں کو ''منکرینِ قرآن'' نہیں کہنا چاہیئے؟ (مؤلف)۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ایک نکتہ

بنجر پاکستان میں باغبانی، جنگل کاری اور آبادکاری کے لئے تمام بے کار افرادی قوت کا صحیح استعمال ہی ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی ہے جو یہ حل کر دے!

(باغبان ایسوسی ایشن)

آصف جلیل

الھدایۃ والعرفان فی تفسیر القرآن بالقرآن
محمد ابو زید الدمنھوری

مندرجہ بالا تفسیر کے ترجمے کی مزید قسط پیش خدمت ہے۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہونے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ادارہ اس سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہے۔

الانعام

(۵۹) اس سے ان دجالوں پر دروازہ بند کیا گیا ہے جو علم غیب کا دعوی کرتے ہیں اور لوگوں کو تباہ کرتے ہیں کہ وہ ان کی توہم پرستیوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اللہ کے طریقہ کار پر عمل کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھئے **النمل ۶۵**

(۶۵۔۶۷) (**وسوف یعلمون**) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ علم سے اذیت دینے والے اور جنگ کرنے کے بہت سے سامان سامنے آئیں گے۔ اور عمل کی نسبت اللہ کی طرف اس لئے ہے کہ اسی نے وہ طریقے وضع کئے ہیں جن کے تحت صنعتیں چلتی ہیں اور ایجادات ہوتی ہیں۔

(۱۰۴۔۱۰۸) رائے اور عقیدے کی آزادی کا اصول اور سوچ اور ارادے کا اختیار۔ دیکھئے **البقرۃ ۲۵۶** اور ق کا آخر۔

(۱۰۶۔۱۰۷) (**ولو شاء اللہ ما أشرکوا**) اس کے لئے ممکن تھا کہ وہ انہیں اپنی اطاعت کے لئے مجبور کر دیتا یا انہیں اختیار اور ارادے سے محروم پیدا کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ یہ چاہا کہ انہیں خود اختیاری دے اور انہیں سوچ اور ارادے کی آزادی دے تا کہ وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہوں اور انہیں محکوم نہیں بنایا۔ یہ اجتماعی تربیت کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دیکھئے ۳۵ پھر **الکھف ۲۹** اور اس کے بعد۔

(۱۱۶) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ گمراہی کی وجہ ظن اور گمان سے کام لینا ہے کیونکہ ہدایت علم اور یقین کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دیکھئے **یوسف ۱۰۳**۔

(۱۱۸۔۱۲۱) ۱۴۵ پر جایئے جہاں جو کچھ حرام کیا گیا ہے اس کی تفصیل ملے گی۔ وہاں یہ معلوم ہوگا کہ **الفسق** وہ ہے جسے غیر اللہ سے منسوب کیا گیا ہو۔ لہذا جس شے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے منع نہیں کیا گیا اگر وہ **فسق** کے زمرے میں نہ آتی ہو۔ **المائدۃ** کے

شروع سے پڑھیں تا کہ دیکھیں کہ (طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم) (جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔)

(۱۳۳۔۱۳۵) (یذھبکم ویستخلف) میں وہ لوگ شامل ہیں جن پر استعماری قوتوں نے غلبہ پالیا ہو۔ کیونکہ قوموں اور گروہوں پر غالب آنے سے وہ انکی قومیت اور آزادی چھین لیتے ہیں۔ کوئی بھی قوم اس طرح ختم نہیں ہوتی کہ اس کی جگہ دوسری آجائے سوائے اس کے وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والی ہو اور اللہ کے طریقہ کار اور فطرت پر چلنے میں کوتاہی کر رہی ہو۔ دیکھئے ۱۳۱ اور ۱۶۵ پھر دیکھئے ھود ۵۷ اور ۷۴ اور اس سے پہلے جس کہانی کا ذکر ہے اور جو الاعراف میں بعد میں ہے۔ پھر پڑھے فاطر ۱۵، ۱۶، ۱۷۔

(۱۴۰) اس آیت میں اولاد کے قتل کا ذکر کھانے کی طیب اشیاء کے ساتھ آیا ہے تا کہ یہ بتائے کہ اولاد معاشرے کے لئے اسی طرح غذا ہے جس طرح کھانا جسم کے لئے ہے۔ اور دونوں اللہ کے رزق میں سے ہیں اور زندگی کے معاون ہیں۔ کوئی بے وقوف یا جاہل ہی اللہ کے رزق سے محروم ہوتا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ اولاد کے قتل کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کی تربیت اور تعلیم میں کوتاہی برتی جائے۔ اور اس طرح کا قتل زیادہ ضرر رساں اور نقصان دہ ہے۔

(۱۴۱) (و آتو حقه) یہ بتایا گیا ہے کہ زمین سے خارج ہونے والی ہر شے میں کسی کا حق ہے جسے ادا کرنا لازمی ہے۔ (یوم حصاده) پیداوار کی مدت۔ اور جن کی ملکیت میں ہے انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہ حق ادا کریں اور حاکم اعلیٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسے وصول کرے اور بیت المال میں جمع کرائے۔ اس کی مقدار کا فیصلہ امت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق فیصلہ کرے۔

(۱۴۸) (لو شاء الله ما اشرکنا) دیکھئے النحل ۳۵۔ یہ حقیقت ہے جسے باطل بنانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح کہ وہ اپنے عمل کا ذمہ دار اپنے الٰہوں کو قرار دیتے ہیں تا کہ ان اعمال کے نتائج سے اور اپنی ذمہ داری سے بچ سکیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ وہ آزاد ہوں اور اپنے اختیار و ارادے میں خود مختار ہوں۔ دیکھئے ۱۰۷۔ (ھل عندکم من علم) اس میں علم کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے کہ حجت اور دلیل صرف علم کی بنیاد پر قبول کی جاسکتی ہے۔ دیکھئے یونس ۶۸ اور الاحقاف ۴۔

(۱۵۸) (او کسبت) یعنی اس نے کچھ حاصل نہیں کیا ہو۔ اس سے یہ سمجھ لیں کہ محض زبانی ایمان کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ لازمی ہے کہ بھلائی حاصل کی جائے یعنی وہ صلاحیت بخش اعمال جن سے نفوس کی اصلاح ہو اور ایمان میں اضافہ ہو اور معاشرہ سدھر جائے۔ دیکھئے البقرۃ ۱۷۷، الانعام ۱۵۴ اور الزخرف ۶۹۔

سورۃ الاعراف

(۳۳۔۳۴) (انما حرم) یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ سوائے مضر اشیاء کے کچھ حرام نہیں کرتا۔ (ولکل امة اجل) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جن اشیاء کو حرام قرار دیا گیا ہے ان کا ان قوموں کے انجام میں بڑا دخل اور اثر ہے۔ اور جس قوم میں منکرات اور فواحش رائج ہوں

ان کا اجتماعی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ زندگی کے لئے جدوجہد کرنے سے اور اس کے معنوی اور مادی پہلوؤں سے ہٹ جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ مختصر عرصہ میں اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے اور دوسری قوموں کی محکومیت میں آ جاتی ہے۔ دیکھئے المائدۃ ۸۷۔۸۸ پھر الانعام ۱۳۱۔۱۳۵۔

(۵۸) (باذن ربہ) کائنات میں اس کے مقرر کردہ نظام کے ذریعے کیونکہ اچھی بستی (یا ملک) کے لوگ اس سیدھے راستے پر چلتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں اور اللہ کے زراعت وغیرہ سے متعلق مقرر کردہ سنتوں (طریقہ کار) پر عمل کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتے۔ اور جو برے اور شر پسند ہوتے ہیں انہیں آپ دیکھیں گے کہ کوتاہی کرتے ہیں جس سے انکی فصل بہت مشکل سے نکلتی ہے یا بہت ہی خراب ہوتی ہے۔ جب اللہ نے لوگوں کی سہولت کے لئے پانی اتارا ہے اور انہیں بتایا کہ نظام اور اسباب کے سوا چارہ نہیں ہے تو پھر وہ کیوں اسکے بتائے ہوئے طریقوں سے کوتاہی برتتے ہیں اور اس کی سنتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور پھر وہ اچھے نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ دیکھئے الفاطر ۹،۷۔۱۸۲ الزمر ۲۱، الطور ۴۳۔۶۴، ۶۵۔۶۶ اور پڑھئے ابراھیم ۲۵ اور اس کے بعد۔

(۷۰) اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی محکومیت میں شرک کرتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے آباء واجداد کی تقلید کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ کو بہت سی قومیں ملیں گی جو ضرر رساں رسموں سے چمٹے رہنے کی وجہ سے گمراہ ہیں۔ ہمارے زمانے میں آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے اللہ کے ولی بنا رکھے ہیں جنکی وہ پرستش اس طرح کرتے ہیں کہ انکے مزاروں پر ہاتھ ملتے ہیں اور ان کی قبروں پر جھکتے ہیں، ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، ان سے اپنی منتیں مانگتے ہیں اور اس کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ انکی پرستش نہیں کرتے اور نہ ہی شرک کرتے ہیں۔ یہ عبادت کے معنی نہیں جانتے اور ان کا حال اہل جاہلیت سے بھی زیادہ خراب ہے۔ دیکھئے المائدہ ۱۰۴ اور اس سے پہلے الزمر کی ابتدائی آیات پڑھئے۔

(۷۳) (ناقة الله) اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف اس لئے ہے کہ اسی نے انہیں چیلنج کیا تھا اور اس پر حملہ کرنے کی صورت میں عذاب دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ویسے وہ عام اونٹنیوں کی طرح ہی تھی جیسا کہ الشعراء میں کہا کہ (هذه ناقة) ۔ مقصود یہ ہے کہ جو زلزلہ آیا تھا وہ طے تھا اونٹنی پر حملہ کرنے کے ساتھ اور اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ ماننے سے۔

(۹۶۔۱۰۲) النحل پڑھئے اور جان لیں کہ آسمان اور زمین کی برکتیں اور ان کے درمیان جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نعمتیں اور فائدہ مند اشیاء کھلی رکھی ہیں ان کے لئے جو انہیں حاصل کرنے کے اسباب اور ذرائع اختیار کریں۔ یہ اسباب ایمان کا میزان اور تقویٰ ہیں۔ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ غیروں نے زمین میں سب کچھ مسخر کر لیا ہے اور اب آسمان میں جو کچھ ہے وہاں تک پرواز کرنا اور انہیں مسخر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم ابھی تک زمین میں موجود زیادہ تر اشیاء سے ناواقف ہیں۔

(۱۰۵) یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کا مشن اپنی قوم کو مصریوں کے استحصال سے بچانا تھا۔ دیکھئے ابراھیم کے شروع سے۔

(۱۰۷۔۱۰۸) یہ ان کی بحث کی طاقت اور دلیل کے ظاہر ہونے کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔

(۱۰۹۔۱۱۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بات سے کتنا خائف تھے حضرت موسیٰ کی قوم کے؟ ان سے بے حد متاثر نہ ہو جائے۔

(۱۱۳۔۱۱۴) (السحرۃ) علماء سوء جو لوگوں کے لئے باطل کو بہت خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح انہیں فرعون یعنی بادشاہ کی خوشنودگی کے لئے حق سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ صلہ لینے اور بادشاہوں سے قربت رکھنے کی خواہش ہر زمانے کے مذہبی عالموں کے لئے پرکشش ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ گمراہ کرتے ہیں اور فساد پھیلاتے ہیں۔

(۱۱۷۔۱۲۲) (عظیم) اس منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ کیسے حضرت موسیٰ کے دلائل نے ان کے جھوٹے دلائل بے نقاب کر دیئے حتی کہ انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ایمان لے آئے۔

(۱۲۳۔۱۲۶) یہ دکھایا گیا ہے کہ ان مذہبی علماء کے حضرت موسیٰ کے ساتھ شامل ہونے سے فرعون کس قدر غضبناک ہوا۔ اس نے انہیں دھمکیاں بھی دیں اور ایسے الزام بھی لگائے جن سے انہیں عوام سے دور کیا جائے تاکہ وہ ان کی باتوں سے متاثر نہ ہو جائیں۔ یہ بھی دیکھئے کہ اسے یہ بات بہت بری لگی کہ اس کے بادشاہ ہوتے ہوئے اس کی اجازت کے بغیر وہ حضرت موسیٰ پر ایمان کیوں لائے۔ کیونکہ اس کے استحصال نے اسے ان کا عادی بنا دیا ہوا تھا اور اسے ان کی ضرورت تھی کہ ان کے عقائد اس کے حکم کے تابع ہوں۔ لیکن اگر اس طرح وہ اپنے اسلام پر ثابت قدم رہتے ہیں اور اس کی طاقت اور گرفت کی بالکل پروا نہیں کرتے تو ان کی شان بڑھ جاتی ہے۔

(۱۲۷) ظالم بادشاہ کے حاشیہ بردار برے لوگوں کا یہ وطیرہ ہوتا ہے کہ اصلاح پسندوں کو دبایا جائے اور بادشاہ کو باور کرایا جائے کہ ایسے لوگوں کا وجود اس کے تخت حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہے۔

(۱۳۱) (لایعلمون) کیونکہ علم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے وہ صرف ان کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بدشگونی اور نحوست پر یقین رکھنے والے اللہ کے نظامِ کائنات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یاسین شروع سے اور الاسراء پڑھئے۔

(۱۶۰) دیکھئے البقرۃ ۶۰ تک۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ (الحجر) جگہ کا نام ہے اور (اضرب بعصاک الحجر) کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف جانے کے راستے پر جاؤ۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ نے انہیں پانی ملنے کی جگہ اور چشموں کی طرف راہنمائی کی۔ دیکھئے الشعراء اور اس میں مذکور واقعے پر غور کریں۔ (المن) درختوں پر پائی جانے والی شہد کی طرح کی کوئی شے۔ (السلوی) پرندے کا نام۔

(۲۰۴) القرآن سے فائدہ حاصل کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اسے سنا جائے اور سمجھنے کے لئے تدبر کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے۔

سورۃ الانفال

(۵) التوبۃ کی آیت ۳۰ سے پہلے اور بعد تک پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ رسول کریم ﷺ اور ان کے صحابہؓ نے جنگ صرف اپنے دفاع میں کی جب انہیں گھر سے نکالا گیا اور ان کے مال پر قبضہ کیا گیا۔ اس کا مقصد غالب آنے کی خواہش تھی اور نہ ملک اور حکومت حاصل کرنے کا بہانہ تھا۔

(۱۴) دیکھئے آل عمران ۱۲۳۔۱۲۷ تا کہ یہ سمجھ لیں کہ یہاں اور وہاں ملائکہ کی تعداد کا مقصد دلوں میں اطمینان کی زیادتی ہے اور اس نفسیاتی قوت اور اللہ پر ایمان کی قوت کی جنگ میں بڑی اہمیت اور اثر ہوتا ہے۔ اور جان لیں اس دین کی اہمیت اور اسکا معاشرے سے تعلق یہ ہے کہ وہ ایک نظام پیش کرتا ہے جس میں لوگوں کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں۔ اس لئے وہ ہمارے لئے جنگ سے متعلق قوانین بھی دیتا ہے اور ہمیں فتح کے اسباب اور اس سے متعلق مادی اور معنوی اسلحہ جمع کرنے میں حد سے گزر جانے سے روکتا ہے۔

(۲۴۔۲۵) جنگ کے سیاق میں (یحیکم) کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ آزادی کی زندگی جس میں امت ہر طرح کی دینی اور وطنی آزادی سے متمتع ہوتی ہے، یہی اصل زندگی ہے جسے کھونے سے ذلت ہوتی ہے اور موت کی مختلف اقسام سے واسطہ پڑتا ہے۔ (فتنۃ) یہ ہمیں غیر ملکیوں کے ہمارے ملک پر قبضے کی یاد دلاتا ہے ان کی ہم پر حکومت اور ہمیں اپنے زیر اثر کرنا یہ سب ہم میں موجود ظالموں کے خلاف ہماری خاموشی کا نتیجہ تھا جو ہمارے اخلاق تباہ کر رہے تھے اور ہماری دولت ضائع کر رہے تھے اور ہماری قوت کمزور کر رہے تھے تا کہ وہ دشمن کو ہم پر قابو پانے کا موقع دے سکیں اور اسے ہم پر مسلط کر سکیں۔ اس طرح کے فتنے سے بچنے کا طریقہ یہ کہ ان ظالموں کے ہاتھ روک دیئے جائیں تا کہ تمام امت پر ان کی وجہ سے سختیاں نہ آئیں۔ آیت کے آخر میں اللہ کی سنتوں سے کوتاہی برتنے کے سبب آنے والے عذاب اور اس کی شدت سے متنبہ کیا گیا ہے۔ اپنی خود مختاری کھو دینے اور استعماری قوت کو اپنے اوپر غالب آنے دینا اس دنیا میں سخت عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو زیادہ سخت اور دائمی ہوگا۔

(۴۱) جنگ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کی تقسیم دراصل (القربی) کے لئے ہے۔ یعنی جو اللہ کے قریب ہوں نہ کہ نسبی لحاظ سے۔ الشوری پڑھئے ۲۳ تک۔

(۵۶) (لایتقون) یہ ان لوگوں کی مذمت ہے جو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور تقوی نہیں کرتے۔ تقوی انسانی ذات کی اخلاقی قدر ہے جو اسے اختیار کرنے والے کو ہر نقصان دہ اور ضرر رساں شے سے دور رکھتی ہے۔

(۶۰) (قوۃ) قوت کی تعریف نہیں کی گئی کیونکہ یہ زمانے کے ساتھ بدلتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ آپ سے دشمنی رکھتے ہیں ان کے لئے وہ ہتھیار تیار رکھیں جو زمانے کے لحاظ سے مناسب ہوں تا کہ وہ آپ سے ڈرے رہیں اور کسی لالچ میں حملہ نہ کریں۔ اس سے یہ بھی ہدایت ملتی ہے کہ جدید جنگی مصنوعات تیار کی جائیں جو اس بات کا اعلان ہے کہ یہ قومی عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔ العادیات پڑھئے۔

(۶۷۔۷۱) حضور ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ قیدی بنا کر فدیہ کا مال حاصل کرنا جنگ کرنے کا مقصد نہیں ہے بلکہ کافروں کی قوت پر ضرب لگانا ہے اور انہیں اس بات سے روکنا ہے کہ وہ آپؐ کے دین اور ملک کے معاملات میں روکاوٹ بنتے ہیں۔ اگر حد یہاں تک پہنچ جائے تو پھر جنگ میں جو قیدی بن سکتے ہوں بنایا جا سکتا ہے۔

(سورۃ الانفال ختم ہوئی۔ جاری ہے)

☆.....☆.....☆

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید

پر

پیشگی ہدیہ تبریک قبول فرمائیے

اے نوعِ انسانی!

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطہ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی' زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

(القرآن الکریم' یونس 10' آیت 58)

SYSTEMS EXCERPT

Saleena Karim

In my previous article (*Tolu-e-Islam* June 2014 issue) I revealed some connections between leading characters of my novel *Systems* and the three Muslim giants Parwez, Iqbal and Jinnah. The aim was to point to the three ideals that are part of the "Cohesive Ethics Theorem" featuring in the novel. The theorem is a real idea inspired from the Quran.

The following excerpt from the novel briefly outlines this theorem and introduces the character behind it who was also mentioned at the end of my previous article.

***

CHAPTER ELEVEN

Leon's Promise

The fifty or so attendees in the small lecture room had listened to the professor with rapt attention for half an hour.

'In short, capitalist democracy focuses on freedom, at the cost of stability; and communism focuses on stability, at the cost of freedom. Since justice and liberty originate from the same source, we should expect to find that where one is present, so is the other. Yet instead we find in the long term that capitalist "liberty" creates inequity, and communist "justice" translates to oppression. Does this mean that the two ideals are incompatible? No. Justice and liberty are actually interdependent. The absence of one means the absence of the other. Therefore we can only conclude that there is neither true liberty nor true justice in either system. We need to set the foundations

that will simultaneously allow for both. Obviously before we can do this, we must learn to differentiate between stability and stagnation, and between freedom and chaos. Then we can choose justice and return to Liberty.'

Soon the professor got to the heart of his proposal.

'In view of the practical difficulties in setting up the original social experiment,' he said, 'I propose an alternative that eliminates the need for physical territory entirely, and in fact provides scope for a more reliable and thorough test.'

What he described next was most interesting indeed.

Leon turned to his right. 'What do you think?' he whispered.

'He's either mad, or a genius,' said David.

Leon smiled. 'Told you this would be one to remember.'

Unlike David, Leon had heard of the infamous professor before. Hanif Omar had a doctorate in linguistics but his real interests revolved around religion, ethics and metaphysics. He was candid about his beliefs, an idealist to the core, and incapable of thinking inside the box. These traits had landed him in trouble in his native Egypt. Academics shunned him, orthodox clerics accused him of heresy, and he'd been in court charged with writing dissenting and inflammatory literature. Most critics called his work madness. But what fantastic madness it was.

Professor Omar was currently causing a storm with a theorem. Had it been a mathematical or physical theorem, any interest in it would have been purely academic, and any objections grounded in logic. But since it concerned ethics, the interest and objections were anything but. Omar believed that justice and freedom are the only universal ideals; all other ethical principles are either derivatives or aspects of these ideals. But justice and freedom are themselves interconnected because they come, just like the physical universe and every law of nature, from a single source. He called this universal relationship cohesive ethics. On its own, the Cohesive Ethics Theorem was benign; but its premise was highly controversial. Omar

claimed he was inspired by principles enshrined in various holy texts, and wasn't shy about attributing his theorem to God.

To preemptively foil the critics, he'd come up with a way to test the theorem. The idea was to set up a small community that would be totally independent for two years. This community would live in a social system with no fixed rules, except for one binding principle which could not be broken under any circumstances. This binding principle represented the Cohesive Ethics Theorem in action, and it would be the only distinctive feature of the system. In 2008 he'd presented the idea to the Egyptian government, asking for permission to be temporarily allotted some land in order to set up the experiment, and recommending that at least a thousand people take part. If the community prospered, it would prove that the theorem worked. Unsurprisingly, the Egyptian government had dismissed the idea out of hand.

Now Omar was presenting a new version of his proposal at Hadescape University, before representatives of the MWA's two main research institutes, the Socioeconomic Commission and the Science and Technology Resources Organisation. Leon and David were attending as representatives of their fields.

'Some would say that what I have suggested is utopian, and moreover impossible,' said the professor. 'This is not so. As I see it, humanity cannot realise its true potential until we accept that an ideal society is not only possible, but absolutely mandatory.'

Leon didn't really understand what the professor meant by that closing remark. But the theorem – and the proposal to test it – had left him and David positively intrigued.

Apparently they weren't the only ones, for a week later SECOM and the STRO gave the go-ahead to fund the experiment.

The Systems Experiment cost 1.2 billion dollars, requiring a

supercomputer to run the complex simulation and the most qualified personnel from the STRO and SECOM to put it all together. Leon and David both had the privilege of working on the project. David, a brilliant systems analyst at the International Computer Science Institute, a subsidiary body of the STRO, was the obvious choice as head of the programming team. Leon, an economist by profession, was one of a number of consultants brought in from a variety of disciplines in social science, to help construct the human element of the simulation.

Of the five socioeconomic systems to be put to the test, two were known historical failures, and so together they acted as the control. The next two were presently being tried in history. The fifth represented Omar's theorem in action, and it was the only one without a name. Omar wasn't keen on giving the model a formal designation. To his mind it created the false impression that his model was offering a fixed system, when in fact dynamism was its driving force. Nevertheless for the sake of the experiment he gave his model a descriptive name:

Libredux.

14 January 2014, Crescent Bay East

The professor entered the coffeehouse in an anorak and rubber boots, his dark wavy hair windswept. Leon and David stood to greet him as he came to their table, and Leon leaned over to shake hands with him. Omar however was preoccupied with his umbrella, which was dripping all over the floor. He propped it against an empty chair before perfunctorily shaking hands with the pair, and sat down.

Three years had passed since work had begun on the Systems Experiment, and Omar was finally looking to be vindicated. The experiment had run for ten weeks, simulating a time frame of two hundred and fifty

years, and the computer had produced data on the five different political systems almost continually. Though the closing results had yet to come through, it was an open secret that the theorem was proven. The implications were enormous. Some were speculating that the theorem had the potential to influence policymaking in individual countries, and thereby affect the character of the Mutual World Alliance as well. The MWA, a body of democratic states, was only a few years old and still finding its feet. No analyst could yet make a long-term forecast of its future. Its destiny was waiting to be written.

The MWA research bodies had conducted the experiment privately, but everyone expected the results to become public knowledge soon. Leon could hardly wait. For days he'd been walking around in an almost constant reverie, elated at the prospect of being part of such a momentous time in history. Omar however had a more self-effacing attitude towards his achievements, and he'd credited the success of the experiment primarily to David. In his typically offbeat style Omar had humorously dubbed him Abdul Salaam, or Servant of the Peace, for bringing about a bloodless "virtual revolution", one that had incurred not a single human casualty.

As these thoughts passed through his mind, Leon hadn't been fully cognisant of the anxious look in the professor's tawny eyes. Omar combed his short neat moustache with his fingernail nervously, lowered his head and with a quiet voice he uttered the most awful words Leon would ever hear in his life.

'They're shutting it down.'

***

Systems is an award-winning visionary science fiction novel inspired by the Quran's core message, and it also pays homage to the Pakistan idea. Visit **libredux.com** for more information.

Surah *Al-Qiyamah* (القیامۃ) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 26

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is April 6, 1984 and today's lecture starts with Surah *Al-Dahr* (الدّھر) (76:1). Let me provide a brief summary of the last lecture.

The theme of "human actions and their inherent consequences" was running through the previous lectures, and that was especially the case in the last lecture. The Arabs of Mecca were being warned of the destructive consequences of their wrong actions; of their wrong life style; of their unjust system. They were told: Whether those destructions come in your lifetime or in your afterlife; nevertheless, they are bound to come, because, life is a continuous stream that runs beyond death. Death does not destroy life; it merely transforms it. The Quran calls the time when the results actually would appear as *Qiyamah* (القیامۃ) or *Hashr* (حشر).

The Arabs used to question that when man dies; that when his body has decayed; that when his bones have disappeared into the ground – then *how* is it possible for man to come back again to life!? The Quran gave answer to this question at a level of intellect that anyone – lay or professional –could appreciate and see the point. It said: You are questioning this about a man and his body? But you accept that this entire Universe and all that it contains was created from nothing. So, if Allah who could create such a gigantic Universe from "nothingness", is it impossible for Him to make dead man alive again from the ingredients which are, nevertheless, present – albeit in different form? My dear friends! Let me mention here that the Quran did not describe the form man will have in the afterlife because we cannot understand it at our present level of consciousness. We have to simply believe that man *will* face the consequences of his actions, if not here, then, for sure, in the Hereafter.

Whether it is Heaven or it is Hell – the Quran describes them metaphorically

My dear friends, what shape or form humans will have in the afterlife cannot be

understood at the present level of human consciousness. The Quran talks about it in metaphorical language. The Quran explains Heaven and Hell by examples only. So, its description of Heaven and Hell should not be taken literally. When the Quran says Hell fire then it does not mean physical fire as it is only mentioned as an example. The same way when the Quran says that the dead will be raised alive in the Hereafter then it does not mean that they will be raised alive in the same form as when they were alive on Earth before death. This is mentioned only to persuade man that this is *indeed* possible for Allah to do; the same way it was possible for Allah to create this huge Universe from nothing which no one can deny – whether a lay person or a top scientist. In the chain of cause-and-effect there comes a point where scientists ultimately hit the wall of what they call uncaused cause – i.e., where there is an effect but there is no cause. So, the Quran asks: how come you deny or doubt the possibility that Allah, who created this huge Universe from nothing, could also bring the dead back to life in the Hereafter?

This was a brief summary of our last lecture. Let me now start today's lecture.

My dear friends, I have mentioned many times that these last two parts (جز 29 and جز 30) of the Quran emphasize the *Life of the Hereafter* and the *Law of Requital*. The Quran tries to explain these in different ways. Arabs – the original addressees of the Quran – used to object that there could be life after death. The Quran addresses this point in the very first verse of this chapter (76:1): هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا – HAS THERE not been an endless span of time before man appeared - a time when he was not yet a thing to be thought of?

Man wasn't worth describing – was شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا

In fact, this is not a question of describing of what man was before he was created. In our language مَذکور means something that could be described. But in Arabic it means that which is present and self-exists: You may say that Allah is nothing even though He created all these things; that He does not exist. But He does not need any description to be believed. He self-exists or is مَذکور. He does not need external proof. Anyway, there was a time when man was nothing: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ – there are few things to note here. One is the word دَهْر – i.e., time.

What is time?—Nothing can be gained by this debate

My dear friends, the discussion of "What is time"? — is a very difficult one in philosophy. Top philosophers get tired of discussing this topic. Suppose you start thinking: Allah exists from the beginning – then what is the meaning of "from the beginning?" Human mind can't think of beyond what we call "beginning" or ازل. Our minds cannot comprehend other than serial time. We also cannot comprehend what we call "ابد" or "Eternity". Human mind is finite and cannot comprehend infinity. In the chain of creation there comes a point that one ends with: God created the Universe. Then one can say: who created God? One can go on and on…This Reductio ad absurdum is due to human finite mind's inability to comprehend Infinite Being. My dear friends, do not get into philosophical arguments about it. It will simply be a waste of time and energy. Allama Iqbal has rightly said: Philosophy turns one away from the realities of life. Philosophy has nothing to do with the actions of real life. Getting bogged down in philosophy is akin to being lost in a web of abstract ideas without finding a way out. I would like to quote Akabar Allahabadi (with slight modification):

I did not engage in any philosophical debates;

Because I didn't have any surplus intelligence!

Akbar Allahabadi had his own unique style! All this abstract arguments are a waste of time. I have spent a better part of my life in these fruitless valleys. And, I am saying this from my own personal experience. So, please! Don't get into this. It has nothing to do with the problems of life. There will be no benefit and only waste of time and energy. This is why the Quran does not get into these types of discussions.

Quranic meaning of دھر (*Dahr*) and عصر (*Asr*)

My dear friends, these ignorant Arabs of the period known as *Jaahiliya* (ignorance) had two words for time: 1) Duration-less time and 2) Serial time. The Quran mentioned these two kinds of times a long time ago which the philosophers have only come to know now. Leave aside philosophy. Those Arab people were ignorant in terms of what we normally call knowledge. But look at their language!? It had two words to describe two different kinds of time even in those days. They used to differentiate between these two different words for time: 1) دھر – meaning very long

duration; something from beginning to end; and 2) عصر – for serial time; for short time. Anyway, the Quran in this verse (76:1) tells: Wasn't a time (دھر) when man did not exist? Why did the Quran use here دھر? Because, Arabs believed that دھر kills. They didn't believe that دھر creates.

The meaning of امر (*Amr*) and خلق (*Khalq*)

It is a limitation of our language that there is only one word for creation. Allama Iqbal explains very clearly the Qur'anic distinction between "امر" and "خلق":

"In order to understand the meaning of the word امر, we must remember the distinction which the Qur'an draws between امر and خلق. Pringle-Pattison deplores that the English language possesses only one word—creation—to express the relation of God and the universe of extension on the one hand, and the relation of God and the human ego on the other. The Arabic language is, however, more fortunate in this respect. It has two words— خلق and امر —to express the two ways in which the creative activity of God reveals itself to us. خلق is creation; امر is direction." (*Reconstruction of Religious Thought in Islam*, 2nd edition, 1989, page 82)

The Quran says: إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (36:82) – His Being alone is such that when He wills a thing to be, He but says unto it, "Be" — and it is. For this kind of creation – before anything takes physical form – there is no word in English but there is a word in Arabic: امر. Once something is created from existing things then in Arabic this process of creation is called خلق. There is another word in Arabic تولید for procreation. I will talk about it later. Allah says that We have created man from Our امر, not دھر. Then He says that you yourself believe that دھر kills you, not that it creates you. There was a time when man was nothing; then We created him; and We enumerated the chain of cause-and-effect of different stages of his evolution in the mother's womb.

My dear friends! This Arabic language is unique. That is the reason this language was worthy of transmission of the Quran – the last and the final Book of Allah; the guidance for humanity containing the universal permanent values. امر is the creation before the start of the chain of cause-and-effect – from nothingness. There is no question of mixing pre-existing things in this stage of the creation – since they do not exist. To create a new thing during this process the Quran uses the word امر. The chain of cause-of-effect takes over during the process of خلق only after a thing is created by

امر. That is the reason the Quran says: إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (76:2) –We created man from نُطْفَةٍ. Please note: it was 1400 years ago that these different stages in the process of development of human embryo were enumerated to a people like Arabs.

The meaning of the word أَمْشَاج

My dear friends, I mentioned in the last lecture that this is miraculous process. Every human begins life from a single cell, formed when male's sperm fertilizes the female's egg. It is so small that it is invisible to the naked eye. In fact, one needs a powerful microscope to see it. In this tiny cell is hidden a full human being with the potential for developing all human faculties. A thing in which different kinds of potentials are present in hidden form is called أَمْشَاج.

My dear friends, please, note that whatever discovery science has made until today on this topic matches exactly with what the Quran said more than 1400 years ago! Scientists remain in awe as to how such a tiny cell that cannot even be seen by the naked eye could contain the seeds of all aspects of human potential? No one is able to convey all this in one word but the Quran has put all these human characteristics present in potential form in such a tiny cell in just one word: "أَمْشَاج". Simply amazing!

Meaning of نَّبْتَلِيهِ

My dear friends, I had also mentioned earlier that we won't be able to understand this from traditional translations. They only mention that by the combination of male sperm and female egg is formed نُطْفَةٍ. But how to actualize the human characteristics that is hidden in potential form in أَمْشَاج? For this the Quran gives the next step: "نَّبْتَلِيهِ". This again we can't understand from traditional translation of "نَّبْتَلِيهِ" which is done as: "We test man". Now please ask yourself: What kind of relationship is there between "أَمْشَاج" and "نَّبْتَلِيهِ"? The embryo is still in the mother's womb in the form of "نُطْفَةٍ" with all the hidden potential? It is not even a child? And "Allah tests him"!? Does it make any sense? Actually, "ابتلاء" does not mean "to test someone". It is wrong to use "ابتلاء" in this sense.

My dear friends, "بلاء" means: to spin something in such a way that it's hidden potential is actualized. For example: extracting the hidden butter from yogurt by

creating a fast spinning motion within the yogurt. This spinning process for extracting the hidden potential from something is called "بلاء" in Arabic.

Actualizing hidden abilities

My dear friends! What an amazing people these Bedouin Arabs were!? They had only camels and sheep. They did not have anything else. They did not know even what fermentation was? But they had a word for: 1) actualizing hidden potential from something; 2) by giving it a spinning motion. They had a single word for both of these things: "بلاء". Our traditional translation is that Allah says: "We test man". Dear friends, does Allah need "to test man to know what he will do"? Does He not know beforehand what man is going to do? Our translators say that Allah tests His pious servants by putting them through hardships and sufferings. These translators are not able to answer this simple question: Why does Allah have to do this? Does He not know already? My dear friends, this is a wrong concept that has become integral part of Islam. The real meaning of "بلاء" as we saw is: to actualize hidden potential of something by giving it a spinning or whirling motion.

Life and its turns

My dear friends, it is common experience that life takes different turns. Everyone goes through life's ups and downs. Uncertain situations appear all the time. Different aspects of life present themselves at each turn. We go through life's trails and struggles all the time. We usually ascribe these events as tuning points in our lives. These happen, as the Quran says, to find out for ourselves whether or not our hidden potentials have become developed and actualized in order to face the challenges posed by these life's turning points. My dear friends, how many of the potentials remain hidden if someone has never faced difficulties and hardships in life? In fact, it is these situations that bring forth one's true character. These character traits really do come out during moments of crisis. For example, who does not know what comes out during moments of frustration and anger? – And, when one, who is accustomed to wealth and easy life, suddenly faces hardships? If these situations did not arise then it would be impossible to know what is hidden deep inside humans. The person himself wouldn't know what is hidden inside him: whether weakness or strength; or whether courage or fear? This single word "ابتلاء" encompasses all these things! The Quran says that when the sperm and the egg meet inside the mother's womb creating a

single cell, then it goes through a process of development via different turns so that all the hidden potentials of the baby are finally actualized; and it comes out in the world as a full-fledged human baby.

The meaning of the word فَجَعَلْنَاهُ

My dear friends, after this the Quran says: فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (76:2) – This way We make him a being with the faculty of hearing and seeing. What to say of the world of امر and the world of خلق! Here the word "فَجَعَلْنَا" has come after خلق. Now, this is the third word – "فَجَعَلْنَا" – that has come for creation. This is even different than the process of خلق by which the lump of flesh came into existence first. But, those who have the knowledge of gynecology know, how this lump of flesh turns into full-fledged baby by going through different stages of evolution inside the mother's womb for nine months. Now, the baby has been given the faculty of hearing and vision. The question is: Why these faculties have been given? This is the Quran my dear friends! So far, it looked like the growth of the baby was following a scientific process that was being described. Everything was happening according to science. Yes! This is true. So far, it is correct that everything was happening scientifically. And at this point an atheist scientist stops. But the Quran goes further and describes the purpose of this creation. The faculties of hearing and seeing have been given because: إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (76:3) – Verily, We have shown him the way: and it rests with him to prove himself either he is grateful or is ungrateful.

Life's two paths

There are now two paths in front of him. He was told: use your ability to hear; use your ability to see; use your ability to comprehend and think: – then decide which path to choose. Since he was given freewill it was necessary that he be given the power of hearing and the power of thinking and vision. The power of سماع and the power of بصر mean that man must use the power of all his senses to acquire knowledge and then arrive at a certain conclusion for himself.

The use of mind (فواد and قلب)

Here the Quran has emphasized the power of سماع (*Sam'a*) and the power of بصر (*Basar*) as a means of acquiring knowledge. These are two sources but there is a third one that the Quran mentions, and that is فواد (*Fuad*) or قلب (*Qalb*). Man sees and hears

and information reaches him through his senses. But then there is something else in him – which the scientists have not yet exactly determined what it is – that makes the decision. How does the man make the decision? How does he use this power to decide whether for right purpose or for wrong purpose? To answer this "*how*", the first thing is that he must have the power of سماع and the power of بصر. That is, he must have the information first. Allah says that We provided all these faculties to him so that he should have all the information; and to show him that there are two possibilities in front of him. This is a special characteristic of human beings only: there are two paths, or two possibilities in front of him. And he has to make a choice for himself: whether to choose the right path or to choose the wrong path. It is precisely because of this power to choose that man becomes accountable.

Animals do not have this characteristic

Animals do not have this choice. There are no two possibilities, no two paths in front of them. They have not been given the power of choice. I have repeated time and again that a poor goat does not have a choice whether to eat grass or whether to eat meat. There is no question about it. Even the powerful lion does not have the choice whether to eat meat or grass. He will die of hunger but will not eat grass. Even if bunches of grapes may be hanging in front of him but he will not turn to them. He has been given his instinct and he is bound by it. Whatever path God determined for him he is bound to follow that path. That is why he is not accountable. When a snake bites a man and the he dies then it is not charged for crime and hanged, because it is not accountable. Accountability is for those who have been given the power of choice and freewill to decide which of the two paths to choose. Only man has been given this power of choice and freewill; and he has been left free to decide for himself. This is what makes him accountable.

My dear friends, the Quran says that there was a time when man did not exist. Then it says that Allah created him. The word used for this creation is خلق, not تولید – إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ (76:2) – We created human beings. Then it says that we created him – مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (76:2) – from a single cell in which were hidden all the human potentials. Then We passed it through several evolutionary stages in mother's womb and We gave him the faculty of hearing and seeing. And all this was done because after this We put two ways before him – إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ (76:3) – And then We told him to choose whichever way you want: إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (76:3). If you want to choose the right way

then go ahead and choose it. If you want to choose the wrong way then it is your choice. These are the stages of human creation that the Quran has enumerated. And, as I mentioned, these are not the issues for scientific discussions. After reaching this point the direction changed. Scientists parted. They did not stretch their reach to the last point – that of accountability. They only go as far as the physical aspect takes them.

Beyond science

The Quran says that We have given humans this power of freewill and freedom of choice in order to make them responsible for their choice and for their actions. This is one thing, *the* most important thing, that distinguishes man from all other creatures: إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (76:3) – Either accept the guidance from Allah or reject it. At another place the Quran says: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) – We have shown him the two highways (of good and evil). الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) – The truth has now come from your Sustainer: let, then, him who wills, believe in it, and let him who wills, reject it. This way the Quran left the choice to man to choose whatever way he wants. Allah did not force man one way or the other. Animals are helpless in this regard. They do not have this power of choice. Allah told the Prophet (PBUH) that your job is only to show the way. It is not your responsibility to force man to walk on the right path. If man were to be forced to walk on the right path then there is no credit for this on his part. It is no credit to a lamb that it does not bite anyone just as it is no crime for a snake to bite and kill someone. It is only man who is accountable as he has been given the freedom of choice. There is no chance of any arguments on this point in the presence of the Quran. The Quran is unequivocal about it: Humans are accountable because they have been shown the two paths; they have been given the freedom to choose; and have been endowed with freewill to make choice. So, we have two groups of people: those who choose the right way and those who choose the wrong way. Now, the Quran says about those who choose to reject its way: إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا (76:4) – Now, behold, for those who deny the truth We have readied chains and shackles, and a blazing flame.

Association with chains and shackles

My dear friends, as for those who made the choice of: وَإِمَّا كَفُورًا (76:3) – i.e., who rejected the right path in favor of the wrong path – they will have to face the

consequences of that choice; they will be held accountable for their actions. But our traditional explanation is that this accountability will happen only in the Hereafter whether it is the punishment of hell; or of fire; or of chains and shackles. Those who choose a wrong path here; those who establish a wrong system here – are they then not accountable in this world? Can anyone in a wrong system call himself free? Are there no chains or shackles facing human beings here, in this world, at every step, in this world? Is not fire raging here in this world which the Quran describes as: نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ ; الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (104:6-7) – A fire kindled by Allah which will engulfs the hearts. Aren't the flames of corrupt systems; flames of exploitation and subjugation of masses by powerful elites; flames of bondage; flames of fetters and chains; and hell fires – aren't all these flames all around us in *this* world? Can anyone deny that these fetters and chains are not *here*? Are these not bound to occur in the world when humans rule over humans without any concern for universal values? Also, there are fetters and chains that are apparent but there are those which are not made up iron and steel. Iron and steel fetters can be broken, and many times criminals break them and run away. But don't ask of the invisible fetters and chains that are created by humans themselves? These are such that they cannot be broken; their flames cannot be extinguished. How to break these invisible chains of (کفر) – chains of wrong system of life? When the train of Islam was put on a different track (more than thousand years ago) then the meaning of all the Quranic terms were changed as well. کفر and کافر to us became unbelief and unbelievers (such as Hinduism and Hindus) unlike its real meaning to lead life under a باطل or wrong system as opposed to leading the life under the right (حق) system. To us Hindus became کافر or unbelievers and الحمدللہ we were مومن or believers!

And, the Quran remained only for reciting Surah یٰسین so that death could come soon. This is in stark contrast to what the Quran says in this Surah itself that it has been sent: لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) – that it may warn everyone who is alive [of heart]; that this Quran is sent so that those who, though they are physically alive but have dead souls, could be revived; so that their souls could be made alive with vitality. But, we use this Surah to hasten the death to the grave.

The Quran talks about ابرار but it also says: O who you call yourselves Muslims, believe in Allah – يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136). Now we know what the life of کفر is and what the life of مومن is? Life of کفر is to lead life under a باطل or wrong system; and

the life of مومن is to lead life under the right (حق) system. Leading a life under باطل or wrong system is leading a life under a non-Quranic system; under the domination and subjugation of other humans – it is to lead a life of humiliation and obedience to other humans. These are the chains which cause flames of heartache and distress. The Quran has mentioned the purpose of sending the Prophet (PBUH) thus: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157) – he will lift from them their weights and break the shackles that were upon them. What were these shackles and weights that Prophet (PBUH) broke and threw away? – These were shackles and the weights of capitalism; of priesthood; of human rule over humans (ملوکیہ) that the Prophet (PBUH) demolished. These were the chains of man-made sharia of the religious priesthood; and the chains of tribalism and tyranny that the Prophet (PBUH) threw away from the society.

The meaning of ابرار

My dear friends! Superstition and falsehood had completely chained human minds and hearts at the time the Prophet (PBUH) came. The Prophet (PBUH) threw them all away. Our traditional scholars say that this has been said about unbelievers. But if they could only see the next verse then it would have been clear what the Quran is talking about here: إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا (76:5). Here, in this verse, the people who lead their lives according to the right (حق) system (i.e., completely free of any human domination) have been called ابرار as opposed to those who follow a wrong (باطل) system. We also use the word ابرار to mean free. What is the system of life in which humans are completely free of any human domination? That system of life is the one in which the obedience is done to no one except to the laws of Allah. That is, *all* human beings are subject to *only* the Divine laws and completely free of any human system of laws:

The One you consider most burdensome of prostrations

In fact, frees man from thousands of other prostrations

The one who bows down on this one door becomes free of all kinds of fetters created by priesthood and human rulers (ملوکیہ). My dear friends! Please don't ask me what ranks the ابرار occupy? What a word ابرار is!? These are the things through which the Quran can be really understood. First, the Quran brought the word ابرار against the word کافر. That is, those who lead their lives under any kind of temporal or religious

domination cannot be ابرار. ابرار will be those without any temporal or religious shackles. That would be the true freedom. Freedom does not mean freedom from physical chains only. Maybe some time one was under physical chain. But if his heart was free then despite having been chained by a tyrant he is really a free man; he is among the ابرار. The one who is solely obedient to Allah's laws becomes completely free from any other human obedience. What should I say my dear friends! Now, it only remains a talk. The eyes are thirsting to see the one who could stand in the ranks of ابرار and pronounce: يَشْهَدُ لا إلٰهَ إلاّ الله – I am a live witness for the fact that there is no other sovereign authority except Allah. And one has to be oneself a live role model first of what one pronounces to the whole world. This is what the companions of the Prophet (PBUH) were: إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا (76:5). My dear friends, you can call that life as the life of heaven (جنّہ). Details of that life are given by the Quran in the form of simile or example: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي (13:35) – The example of that heaven is like this …. So my friends, whatever has been said about heaven in the Quran please do not take its literal or dictionary meaning.

Beautiful allegory of كافورا and زنجبيلا

My dear friends, there are huge realities hidden in these words. For example, ابرار are having cups to drink: مِزَاجُهَا كَافُورًا (76:5) and just few verses after it the Quran says: مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا (76:17). Actually these both كافور and زَنجَبِيل are used in native medicine. In our countries, people spray كافور in the coffins of the dead. But it is used as medicine to reduce fever. As opposed to this, if someone is feeling cold or weak, then he is given زَنجَبِيل. Actually, زَنجَبِيل is ginger. So, both كافور and زَنجَبِيل are used to bring human temperature to normal. What the Quran has said in these verses is very revealing: the entire point of man's character is that it should remain normal – extremes on either side in his personality are bad for his character. There should be something to stop man from either extreme and bring him to normal state. And that something is Allah's commandment. Wherever there are exploitation and subjugation, people lose their strength and become weak, and feel suppressed. Then the people are given a dose of زَنجَبِيل, that is, they are taught Allah's commandment which gives them warmth and energy to become fit for the life of heaven. And vice versa – too much power leading to excess and extreme must be tempered by Allah's commandment which, in this case, is كافور. The characteristic of heavenly life is that it does not have weakness and it does not have arrogance of power. It is a life of balance. Extreme on either side is dangerous.

Advice of Omar (R) to one of his governors

When Omar (R) appointed a governor he asked for Omar's advice regarding what to look for when appointing people to various administrative posts. Omar told him: "I can't give you a long list of advice but I only want to tell you a basic principle. Be away from those who are "weak but honest" and from those who are "strong but dishonest". Other than them you can appoint anyone." What a criterion!? What a great visionary Omar was!? It is universally true that plenty of damage is done by those having any of the two personality traits mentioned by Omar. Having a balance between these two extremes is true way to peace; and that is the life of heaven. When power starts acting in extremes then rein it in; and when weakness finds its way then strengthen it – this is the state of balance or heaven. It should never happen in this state that anyone is able to take advantage anyone else: إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا (76:5). The next verse is: عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (76:6). This is a miraculous verse of the Quran.

Deriving water from rocks of heart

My dear friends, it is my earnest prayer that you also get to taste the pure heavenly elixir from the cup of Quranic wisdom. Then only you will know how tasty it is. But this taste is felt by heart and soul, not by tongue. It is hard to explain to others unless one tastes himself. Here it is said in this verse (76:5) that it is something for drinking. (In Arabic language anything for drinking is called شراب (*Sharaab*) unlike in our language where it means wine.) Most importantly, the next verse says that this drink comes from a fountain. But where is that fountain from which this drink is obtained? The Quran says that the people of the heaven produce this fountain. But don't think that there is hilly rock in heaven from which oozes out a fountain from which the people of heaven fill their cups! This is the Quran my dear friends!! It says: يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (76:6) – they dig this fountain from deep inside of their own hearts and produce their own drink from it. When it is little weaker in its potency then a little ginger is added; and when it is little stronger in its potency then a little calyx is added. But, nevertheless, they bring out this fountain themselves from deep inside of their hearts and soul. How this is brought out? If you remember whenever the issue of bread came in the past lectures, the Quran gave instructions as to how to take care of the hungry? Now, this fountain coming from the heaven created by the people of heaven deep inside of their own hearts, what will it do to them? The Quran says next:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (76:7) – The truly virtuous are they who fulfil their obligation of providing universal sustenance willingly of their own choice, and stand in awe of a Day the woe of which is bound to spread far and wide.

My dear friends! Please pay attention to what the Quran is saying here. It says that they have happily taken upon themselves this responsibility of their own freewill and choice. The Quran never thrusts responsibility on anyone by force. Believer (مومن) by his own freewill accepts the Quranic responsibility.

The dictionary meaning of نذر

We use this word نذر for offering sacrifice or gifts in case some wish is fulfilled. But in Arabic language it means: the precaution that is taken for protection from some impending danger. Every messenger of Allah is نذیر because he warns people from impending danger. So, here in this verse (76:7) نذر means that these people fulfill the responsibility they willingly impose upon themselves to protect the society from evil sparks.

Scope of evil and protection from its danger

My dear friends, the question then is: Yes, they have taken upon themselves this responsibility. But what is their motive behind it. My dear friends, whatever man does, there is a feeling behind it; there is a motive behind it. Here, in this verse, their motive is given: they do it because if it was not done then the spark of evil will "fly" and engulf everyone in the society. There are two words here: شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا. Today, not just our own world but the entire world is engulfed in this. This is just one word شَرٌّ – but every kind of evil, every kind of bad thing, everything that is harmful is included in this one word شَرٌّ. Actually, it means spark that creates a flame that burns everything. It bellows and it expands on its own engulfing everything in its path. It is okay that I did some evil. It remains with me. Someone else does evil, and it remains with him. But very soon it becomes contagious and starts infecting the whole society – just as we say these days that no one can remain protected from corruption; that corruption has taken over the entire society. Why is this so and how can it be prevented? The Quran uses one word for this. It says that they (مومنین) are always concerned and are always fearful that this does not happen; that the spark of evil starting somewhere does not start flying everywhere. That is, it is not that people go to the spark but the spark comes to them flying. Therefore, the مومنین are always

conscious of their responsibility which they have undertaken of their own freewill; and are fearful that if they did not fulfill this responsibility then a society will come into existence in which no one will be safe from the spark of evil.

My dear friends, we also have this word "شرر" for spark. Sparks fly. Sparks of evil also fly and engulf everyone. That is, no one remains safe. This is what the مومنین are always afraid of. So they are diligent and 100% committed to fulfill their responsibility to stop it. Did you notice my friends, how conscious they are of their duties and their responsibilities!?

My wealth shouldn't go to others

To stop this spark (of evil) from flying it is necessary to establish a system based on universal welfare: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (76:8) – and who give food - however great be their own want of it - unto the needy, and the orphan, and the captive. That is, they establish a system in which no one sleeps hungry regardless of their physical situation. They give all they have to establish this system although there is too much attraction for keeping the wealth. But, many succumb to this greed causing misery to themselves and to others. These people who pile wealth are hardly able to use it for themselves because there needs are limited. But their greed is unlimited. So, they start accumulating and hoarding it. Their greed follows them to the grave: أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ; حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) – YOU ARE OBSESSED by greed for more and more until you go down to your graves. So much is the attraction for them to wealth. On the other hand, despite this attraction, the مومنین see to it that other's need are also met. So, they freely give their surplus wealth to establish the system of universal welfare and nourishment. This way, by their selfless effort, that society never takes root in which sparks of evil keep flying everywhere. When people's needs aren't met by just means then they start trying unjust means to fulfill their needs; and very soon evil sparks start flying; and flames of evil take over the entire society. Therefore, for this reason, the مومنین make sure this does not happen. The question is: what do they do to stop it?

The remedy to remain safe from evil sparks and wicked flames

My dear friends! To stop this flame from occurring they establish a system of nourishment for everyone; be they hungry, or indigent, or orphan, or handicap. This theme keeps coming in the Quran again and again. From this itself one can

understand how important it is in the eyes of Allah to do this. *How* to do it; how to establish such a system? One way is to help a needy person as favor and expect some favors in return – like votes. If he does not return the favor then denigrate him publically. This is one way to help the needy. But this is precisely the way the sparks of evil start flying and landing everywhere. In contrast, the مومنین, when they help anyone, their attitude and behavior is different than that described above: إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (76:9) – [saying, in their hearts,] "We feed you for the sake of God alone: we desire no recompense from you, nor thanks. They say that by helping you we did not do any favor to you. Not at all! In fact, we do not want even thanks from you! اللہ اکبر! In spite of the attraction to wealth (عَلَىٰ حُبِّهِ -76:8) they give it to others and their attitude is that they do not want even a "thank you!"

The feeling of those drinking the heavenly drink

My dear friends! This is what happens to someone who drinks this drink. This is how a heavenly society is created by those who drink the heavenly drink. Here it only said that they do not even want a "thank you" note from those whom they help. In other place the Quran says: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) – They give them preference over themselves, even though poverty maybe their own lot. This is the attitude of those who give; and they say: إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (76:10) – Behold, we stand in awe of our Sustainer's judgment on a distressful, fateful Day!

My dear friends, we will discuss this verse (76:10) in the next lecture. But please remember this: These مومنین say that they do not want any recompense or even a "thank you" in exchange for their help. What to say of that society where this prevails? – Where those with surplus wealth keep looking for those whose needs are unmet; and where those who help do not expect anything in return, not even thanks! What a wonderful society that would be! That would, indeed, be a heavenly society!!

My dear friends! We have come up to verse 9 of Surah *Al-Dahr* (الدّھر) today. We will take up from verse 10 in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
7

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

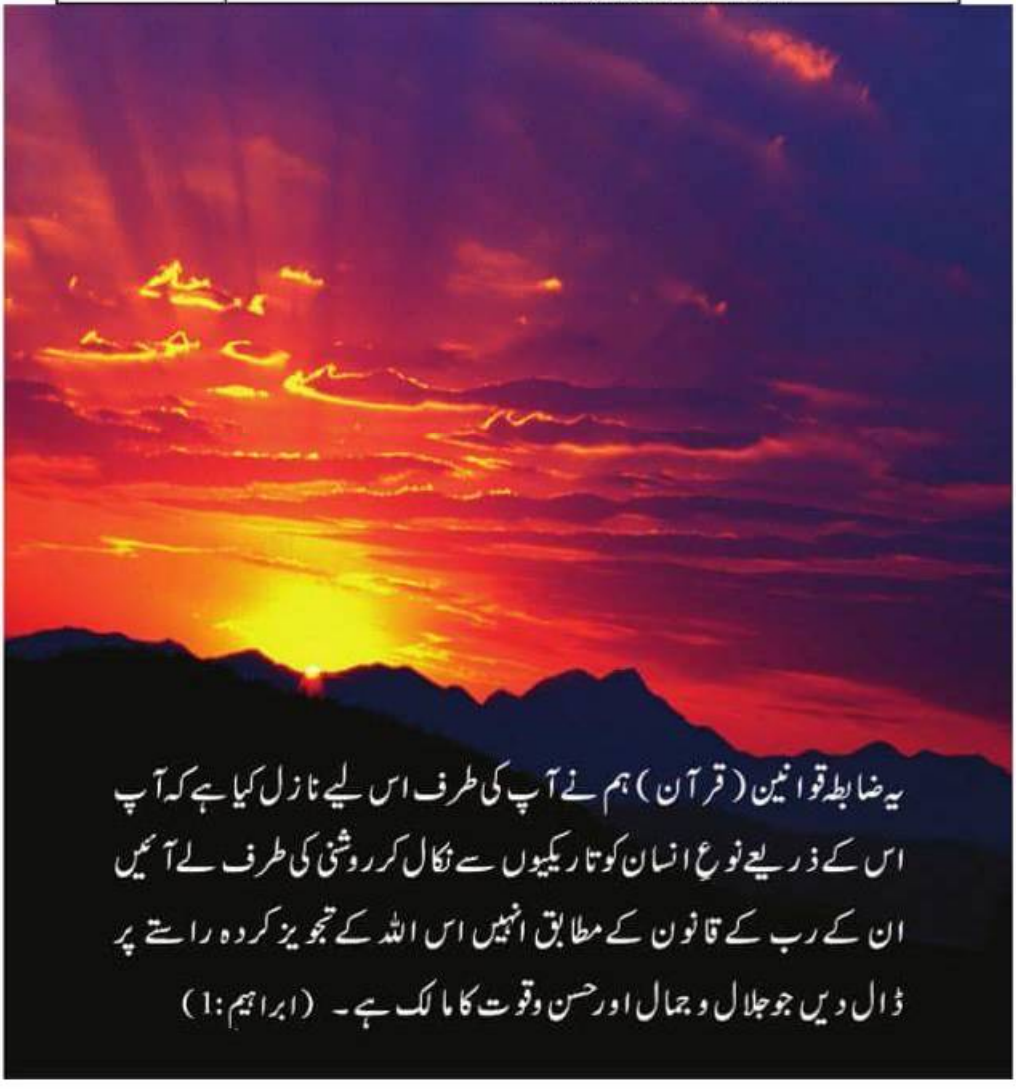

یہ ضابطہ قوانین (قرآن) ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں ان کے رب کے قانون کے مطابق انہیں اس اللہ کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دیں جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (ابراہیم:1)